جولائی ۲۰۰۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

کیا ہماری مہلت ختم ہو رہی ہے؟

حال ہی میں امریکہ نے مہمند ایجنسی میں راکٹوں سے جو حملہ کیا ہے‘ جس کے نتیجے میں ایک میجر سمیت ہمارے چالیس سے زائد فوجی اور سویلین جاں بحق ہو گئے ہیں‘ یہ امریکہ کی طرف سے ریاستی دہشت گردی کا بدترین مظاہرہ ہے۔ یہ ہماری سالمیت اور خودمختاری پر حملہ ہے۔ لیکن یہ حملہ پہلی بار نہیں ہوا‘ اِس سے پہلے بھی ہم پر کم وبیش ۴۴ حملے ہو چکے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے بے حمیت حکمرانوں نے اکثر وبیشتر قوم کے سامنے جھوٹ بولا اور حملوں کی ذمہ داری اپنے سر لیتے رہے‘ اور ذرائع ابلاغ کی اِس ترقی کے دور میں عوام سے حقائق مخفی رکھنے کی احمقانہ کوششیں کرتے رہے۔

امریکہ کے تازہ حملہ سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ وہ بہرصورت ہمیں اپنا غلام بنانا چاہتا ہے اور صفحۂ ہستی پر پاکستان نامی آزاد وخودمختار ایٹمی قوت کا وجود اُسے کسی صورت گوارا نہیں۔ اِس جارحیت سے نام نہاد دہشت گردی کے خلاف طاغوتی جنگ کی حقیقت بھی اب ہر خاص وعام پر واضح ہوتی جا رہی ہے۔ نائن الیون کے واقعہ کے بعد ہم نے افغان مسئلہ پر بظاہر تورا بورا بننے کے اندیشہ سے گھبرا کر ایک حد درجہ نامعقول‘ غیر اخلاقی اور غیر شرعی پالیسی اختیار کی۔ فوجی صدر پرویز مشرف نے قوم سے کہا کہ یہ فیصلہ ہم نے ملک وقوم کے وسیع تر مفاد میں کیا ہے۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ فیصلہ سراسر غلط تھا۔ چنانچہ اب وہ سارے اندیشے حقیقت بن کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں جن کا اظہار ممتاز عسکری ماہرین اور دین وملت کا درد رکھنے والے سنجیدہ لوگ کر رہے تھے۔ صدر پرویز مشرف نے تب اپنے اِس فیصلے کی جو مصلحتیں گنوائی تھیں‘ وہ بھی ایک ایک کر کے کب کی ہوا میں تحلیل ہو چکی ہیں۔ کہا گیا تھا کہ کشمیر کاز کو تقویت ملے گی‘ امریکہ بھارت کے مقابلے میں ہمیں زیادہ اہمیت دے گا اور ہمیں معاشی استحکام حاصل ہوگا۔ قومی خودداری اور اپنے مسلمان افغان بھائیوں کے خون کا سودا کرنے کے نتیجے میں ہمیں متذکرہ فوائد تو حاصل نہ ہوئے‘ نہ ہونے تھے‘ البتہ آج ہماری اپنی خودمختاری اور سلامتی داؤ پر لگ گئی ہے۔ امریکہ جب چاہتا ہے ہمارے ملک پر جارحیت کرتا ہے‘ جس سے کئی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

افغان مسئلے پر امریکہ کی اطاعت کی پالیسی اپنا کر جب ہم امریکی غلامی کی راہ پر چل نکلے تو پھر اپنا ہر مفاد‘ ہر چیز اُس کی قربان گاہ پر قربان کر ڈالی۔ ہم نے کشمیر پالیسی سے یوٹرن لیا‘ نظریۂ پاکستان سے منہ موڑا اور دینی اقدار سے یوٹرن لیا۔ ہم ریاستی سطح پر اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج واشاعت کی بجائے امریکہ سے درآمدہ نام نہاد روشن خیالی اور اعتدال پسندی کو بزورِ قوت قوم پر مسلط کرتے رہے۔ اپنے ’’آقا‘‘ کی خوشنودی کے لیے دین کا حلیہ بگاڑا اور دجالی مغربی تہذیب کو پھیلایا۔ اِسی کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں ملک میں فحاشی وعریانی‘ شیطنت اور دجالیت کا سیلاب آیا ہے۔ سرکاری سرپرستی میں عریانیت کی اشاعت‘ راگ رنگ کی محفلوں کے انعقاد اور موسیقی کے پروگراموں نے ہمیں اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا پر پھیلائی گئی اخلاق باختگی پر مستزاد بل بورڈز کے ذریعے بھی عریانیت کو عام کیا جا رہا ہے۔ یہاں فیشن شو اور کیٹ واکس ہو رہی ہیں‘ جن کا اِس سے

پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ موبائل فون کمپنیوں کو بھی کھلی چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ جیسے چاہیں ہماری روایات واقدار کا جنازہ نکالیں اور نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑیں۔ یہ سب کچھ درحقیقت مغربی دجالی تہذیب کے مظاہر ہیں‘ یہ شیطنت ہے جو سرکاری سرپرستی میں ہمارے سماج پر مسلط کی جارہی ہے‘ اور یہ واردات اُس قوم کے ساتھ ہو رہی ہے جس نے اللہ سے اِس وعدہ کے ساتھ ایک آزاد اور خودمختار ملک حاصل کیا تھا کہ اُس میں تیرے دین کا بول بالا کریں گے‘ اور یہ شیطنت اُس سماج پر ٹھونسی جارہی ہے جس کی اکثریت معاشی بدحالی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے‘ اور جہاں آئے روز خودکشیاں ہوتی رہتی ہیں۔

بحیثیت قوم آج جو ہماری حالت ہے‘ اللہ سے ہم نے سرکشی اور نافرمانی کا جو شیوہ اختیار کر رکھا ہے‘ یہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی روش ہے۔ ہم اپنا جائزہ لیں‘ گزشتہ آٹھ سالوں میں ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیا عذاب کے اسباب ہم نے فراہم نہیں کر لیے ہیں؟ کیا دین سے بے اعتنائی اور وہ خرابیاں ہم میں پیدا نہیں ہوگئی ہیں کہ جن کے سبب اللہ تعالیٰ عذاب نازل کرتا ہے؟ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بحیثیت قوم ہماری مہلت عمل ختم ہوچکی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہمارا طبقۂ امراء عیش وعشرت میں غرق ہو چکا ہے اور اُس نے فسق وفجور کا بازار گرم کر رکھا ہے؟ جشن بہاراں کے نام پر عیش ومستی کے پروگرام ہوتے ہیں‘ شراب نوشی کے دور چلتے ہیں اور راگ رنگ کی محفلیں ہوتی ہیں۔ اِس وقت ہم جس زبوں حالی کا شکار ہیں اور آئے روز امریکہ ہم پر جارحیت کرتا ہے اِس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے مالک وخالق کو ناراض کر دیا ہے۔ بحیثیت قوم ہم نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اللہ سے سرکشی‘ نافرمانی اور بغاوت کی روش اپنا رکھی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس روش کو تبدیل کریں‘ اللہ کی جانب رجوع ہوں اور اُس کے رسولِ رحمتﷺ کی تعلیمات اور اسوۂ زندگی کو اختیار کریں۔

امریکہ ہماری سرحدوں پر جو جارحیت کر رہا ہے‘ یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ نہیں‘ بلکہ پاکستان پر باقاعدہ یلغار کی ابتدا ہے۔ پاکستان پر حملہ کے لیے اُس نے القاعدہ رہنماؤں کی موجودگی کو بہانہ بنانا ہے۔ اِس سے پہلے بھی اُس نے جو جارحیت کی ہے اُس کا بظاہر سبب یہی بتایا ہے کہ فلاں علاقے میں فلاں ’’دہشت گرد‘‘ موجود تھا۔ دراصل امریکہ ایک پلاننگ کے تحت آہستہ آہستہ ہمیں کارنر کر رہا ہے۔ اگر افغانستان اور عراق پر اُس نے براہِ راست حملہ کیا ہے تو وہ یہاں بھی کر سکتا ہے۔ امریکہ کے آئے روز کے حملوں کو ہمیں اِسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس ضمن میں اہم ترین بات یہ ہے اِس صورتحال سے چھٹکارا کیونکر ہو۔ اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم سب اللہ کی جناب میں سچی توبہ کریں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے گناہوں پر اللہ سے معافی مانگے۔ اجتماعی سطح پر ملک میں وہ نظامِ خلافت قائم کیا جائے جس کی خاطر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ ہمارا اِس بات پر ایمان ہے کہ کائنات کی کل طاقت واختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کو منالیں تو وہ ضرور ہماری مدد فرمائے گا‘ اور جسے اللہ کی مدد اور نصرت حاصل ہو جائے‘ دنیا کی کوئی طاقت اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اور اگر ہم اپنی روش پر چلتے رہے‘ دین وشریعت کو پاؤں تلے روندتے رہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت‘ کوئی وسیلہ ہمیں دشمن کی یلغار سے نہ بچا سکے گا۔

☆☆☆

زیرِ نظر شمارے سے ماہنامہ میثاق میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے بیان کردہ دورۂ ترجمۂ قرآن کی اشاعت کا آغاز ہو رہا ہے۔ قبل ازیں یہ سلسلہ ’’حکمت قرآن‘‘ میں جاری تھا۔ لیکن حکمت قرآن کے سہ ماہی ہوجانے کی بنا پر وقفے کی طوالت قارئین پر گراں گزر رہی تھی۔ چنانچہ یہ سلسلہ ’’میثاق‘‘ میں منتقل کیا جا رہا ہے‘ تاکہ اس کی ماہ بماہ اشاعت سے بہتر طور پر استفادہ کیا جاسکے۔ OO

*

1

دورۂ ترجمۂ قرآن | ڈاکٹر اسرار احمد

سُورةُ البقرة

آیات ۲۶۱ تا ۲۷۳

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ
سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ
وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ
مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی ۙ لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ
وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُھَآ
اَذًی ؕ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ
الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ
صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ
الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ
وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ کَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَھَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُکُلَھَا
ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْھَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾
اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ
تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۙ لَهٗ فِیْھَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْکِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ
ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَھَآ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ
الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا

كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ
تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ
حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ
يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ
يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ
وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ
سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ
اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا
ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾
لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى
الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا
يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ۞

اب جو دو رکوع آ رہے ہیں' ان کا موضوع انفاق فی سبیل اللہ ہے' اور اس موضوع پر یہ قرآن مجید کا **ذروۃ السنام** (climax) ہے۔ ان کے مطالعہ سے پہلے یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اپنا مال خرچ کرنے کے لیے دین میں کئی اصطلاحات ہیں۔ سب سے پہلی ''اِطعامُ الطّعام'' (کھانا کھلانا) ہے: ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ﴿۸﴾﴾ (الدھر) دوسری اصطلاح ایتائے مال ہے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ......الخ﴾ (البقرۃ:۱۷۷) پھر اس سے آگے صدقہ' زکوٰۃ' انفاق اور قرضِ حسنہ جیسی اصطلاحات آتی ہیں۔ یہ پانچ چھ اصطلاحات (terms) ہیں' لیکن ان کے اندر ایک تقسیم ذہن میں رکھیے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے مال خرچ کرنے کی دو بڑی بڑی مدیں ہیں۔ ایک مد ابنائے نوع پر خرچ کرنے کی ہے۔ یعنی قرابت دار' غرباء' یتامیٰ' مساکین' محتاج اور بیواؤں پر خرچ کرنا۔ یہ آپ کے معاشرے کے

*

اجزاء ہیں، آپ کے بھائی بند ہیں، آپ کے عزیز واقرباء ہیں۔ ان کے لیے خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور اس کا اجر ملے گا۔ یہ بھی گویا آپ نے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خرچ کیا۔ جبکہ دوسری مد ہے عین اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا۔

قرآن حکیم میں انفاق اور قرض حسنہ کی اصطلاحیں اس دوسری مد کے لیے آتی ہیں اور پہلی مد کے لیے اطعام الطعام، ایتائے مال، صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کی اصطلاحات ہیں۔ چنانچہ انفاقِ مال یا انفاق فی سبیل اللہ سے مراد ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، اللہ کے دین کی دعوت کو عام کرنے اور اللہ کی کتاب کے پیغام کو عام کرنے کے لیے خرچ کرنا۔ اللہ کے دین کی دعوت کو اس طرح ابھارنا کہ باطل کے ساتھ زور آزمائی کرنے والی ایک طاقت پیدا ہو جائے، ایک جماعت وجود میں آئے۔ اس جماعت کے لیے ساز وسامان فراہم کرنا تاکہ غلبۂ دین کے ہر مرحلے کے جو تقاضے اور ضرورتیں ہیں وہ پوری ہوسکیں، اس کام میں جو مال صرف ہوگا وہ ہے انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کے ذمہ قرضِ حسنہ۔ تو یہاں اصل میں اس انفاق کی بات ہو رہی ہے۔ عام طور پر فی سبیل اللہ کا مفہوم بہت عام سمجھ لیا جاتا ہے اور پانی کی کوئی ''سبیل'' بنا کر اسے بھی ''فی سبیل اللہ'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے، وہ بھی سبیل تو ہے، نیکی کا وہ بھی راستہ ہے، سبیل اللہ ہے، لیکن ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا مفہوم بالکل اور ہے۔ فقراء ومساکین اور اہل حاجت کے لیے صدقات وخیرات ہیں۔ زکوٰۃ بھی اصلاً غریبوں کا حق ہے، لیکن اس میں بھی ایک مد ''فی سبیل اللہ'' کی رکھی گئی ہے۔ اگر آپ کے عزیز واقارب اور قرب وجوار میں اہل حاجت ہیں، غرباء ہیں تو صدقہ وزکوٰۃ میں ان کا حق فائق ہے، پہلے ان کو دیجیے۔ اس کے بعد اس میں سے جو بھی ہے وہ دین کے کام کے لیے لگائیے۔ جب دین یتیمی کی حالت کو آ گیا ہو تو سب سے بڑا یتیم دین ہے۔ اور آج واقعتاً دین کی یہی حالت ہے۔ اب ہم ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

آیت ۲۶۱ ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ﴾ ''مثال ان کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں (اللہ کے دین کے لیے) خرچ کرتے ہیں ایسے ہے جیسے ایک دانہ کہ اُس سے سات بالیاں (خوشے) پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔''

اس طرح ایک دانے سے سات سو دانے وجود میں آ گئے۔ یہ اُس اضافے کی مثال ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کے اجر وثواب میں ہوگا۔ جو کوئی بھی اللہ کے دین کے

لیے اپنا مال خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے مال میں اضافہ کرے گا' اس کو جزا دے گا اور اپنے یہاں اس اجر و ثواب کو بڑھاتا رہے گا۔

﴿وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ﴾ ''اللہ جس کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔''
یہ سات سو گنا اضافہ تو تمہیں تمثیلاً بتایا ہے' اللہ اس سے بھی زیادہ اضافہ کرے گا جس کے لیے چاہے گا۔ صرف سات سو گنا نہیں' اور بھی جتنا چاہے گا بڑھاتا چلا جائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۶۱﴾﴾ ''اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''
اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔

آیت ۲۶۲ ﴿اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ﴾ ''جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں''

﴿ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی ۙ﴾ ''پھر جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں''
ان کا طرزِ عمل یہ نہیں ہوتا کہ دیکھئے جی' میں نے اُس وقت اتنا چندہ دیا تھا' معلوم ہوا کہ میرا حق زیادہ ہے' ہم چندے زیادہ دیتے ہیں تو پھر بات بھی تو ہماری مانی جانی چاہیے! یا اگر کوئی شخص اللہ کے دین کے کام میں لگا ہوا ہے اور آپ اس کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں تاکہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو کر اپنا پورا وقت دین کی خدمت میں لگائے' لیکن اگر کہیں آپ نے اس کو جتا بھی دیا' اس پر احسان بھی رکھ دیا' کوئی تکلیف دہ کلمہ کہہ دیا' کوئی دلآزاری کی بات کہہ دی تو آپ کا جو اجر و ثواب تھا وہ صفر ہو جائے گا۔

﴿لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۶۲﴾﴾ ''ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس محفوظ ہے۔ اور نہ تو ان کے لیے کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ کسی رنج و غم سے دوچار ہوں گے۔''

آیت ۲۶۳ ﴿قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ﴾ ''بھلی بات کہنا اور درگزر کرنا''

﴿خَیۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ یَّتۡبَعُهَاۤ اَذًی ؕ﴾ ''بہتر ہے اس خیرات سے جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے۔''
اگر آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آ گیا ہے' کسی نے ہاتھ پھیلا دیا ہے تو اگر آپ اس

*

3

کی مدد نہیں کر سکتے تو دلداری کا ایک کلمہ کہہ دیجیے‘ نرمی کے ساتھ جواب دے دیجیے‘ معذرت کر لیجیے۔ یا اگر کسی سائل نے آپ کے ساتھ درشت رویہ اختیار کیا ہے تو پھر بھی اسے ڈانٹیے نہیں۔ ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡهَرۡ﴾(الضحیٰ) بلکہ درگزر سے کام لیجیے۔ یہ طرزِ عمل اس سے کہیں بہتر ہے کہ ضرورت مند کو کچھ دے تو دیا لیکن اس کے بعد اسے دو چار جملے بھی سنا دیے‘ اس کی دلآزاری بھی کر دی۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

﴿وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ﴾ ”اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حلیم ہے۔“

وہ بے نیاز بھی ہے اور بردبار بھی۔ اگر تم کسی کو کچھ دے رہے ہو تو اصل میں اللہ کو دے رہے ہو۔ اس ضمن میں ایک حدیث قدسی میں بڑی وضاحت آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”قیامت کے دن اللہ عزوجل فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں تیری تیمارداری کیسے کرتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی تیمارداری نہیں کی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی تیمارداری کرتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا! ـــــ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا‘ تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا: اے میرے ربّ! میں تجھ کو کھانا کیسے کھلاتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا‘ تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا! ـــــ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا‘ تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا: پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا‘ تو نے اس کو پانی نہیں پلایا تھا‘ کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر تو اس کو پانی پلا دیتا تو اپنے اس عمل کو میرے پاس موجود پاتا!“(۱)

چنانچہ یاد رکھو کہ جو کچھ تم کسی ضرورت مند کو دے رہے ہو وہ درحقیقت اللہ کو دے رہے ہو‘ جو غنی ہے‘ جس نے تمہیں سب کچھ عطا کیا ہے۔ اور تمہارے طرزِ عمل کے باوجود بھی اگر وہ تم سے درگزر کر رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حلیم ہے‘ بردبار ہے۔ اگر تم اپنے دل سے اتری

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب فضل عیادة المریض۔

ہوئی شے اللہ کے نام پر دیتے ہو‘ کوئی بے کار اور ردی چیز اللہ کے نام پر دے دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی غیرت اگر اسی وقت جوش میں آ جائے تو تمہیں ہر نعمت سے محروم کر دے۔ وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے‘ لیکن نہیں کرتا‘ اس لیے کہ وہ حلیم ہے۔

آیت ۲۶۴ ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی﴾ ’’اے اہل ایمان! اپنے صدقات کو باطل نہ کرلو احسان جتلا کر اور کوئی اذیت بخش بات کہہ کر‘‘

﴿کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ ’’اس شخص کی طرح جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لیے‘‘

اگرچہ اپنا مال خرچ کر رہا ہے‘ لوگوں کو صدقات دے رہا ہے‘ بڑے بڑے خیراتی ادارے قائم کر دیے ہیں‘ لیکن یہ سب کچھ ریا کاری کے لیے‘ سرکار دربار میں رسائی کے لیے‘ کچھ اپنے ٹیکس بچانے کے لیے اور کچھ اپنی ناموری کے لیے ہے۔ یہ سارے کام جو ہوتے ہیں اللہ جانتا ہے کہ ان میں کس کی کیا نیت ہے۔

﴿وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ’’اور وہ ایمان نہیں رکھتا اللہ اور یومِ آخرت پر۔‘‘

جو کوئی ریا کاری کر رہا ہے وہ حقیقت میں اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ ریا اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں‘ جیسا کہ یہ حدیث ہم متعدد بار پڑھ چکے ہیں:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ‘ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))(۱)

’’جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا‘ جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا‘ اور جس نے دکھاوے کے لیے لوگوں کو صدقہ و خیرات دیا اُس نے شرک کیا۔‘‘

﴿فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ﴾ ’’تو اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر کچھ مٹی (جم گئی) ہو‘‘

اگر کسی چٹان پر مٹی کی تھوڑی سی تہہ جم گئی ہو اور وہاں آپ نے کچھ بیج ڈال دیے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی فصل بھی اُگ آئے‘ لیکن وہ انتہائی ناپائیدار ہوگی۔

﴿فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ فَتَرَکَہٗ صَلْدًا﴾ ’’پھر اس پر زوردار بارش پڑے تو وہ اس کو

(۱) مسند احمد:۱۶۵۱۷۔

بالکل صاف پتھر چھوڑ دے۔‘‘

بارش کے ایک ہی زوردار چھینٹے میں چٹان کے اُوپر جمی ہوئی مٹی کی تہہ بھی بہہ گئی‘ آپ کی محنت بھی ضائع ہوگئی‘ آپ کا بیج بھی اکارت گیا اور آپ کی فصل بھی گئی۔ بارش سے دھل کر وہ چٹان اندر سے بالکل صاف اور چٹیل نکل آئی۔ یعنی سب کچھ گیا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاکاری کا یہی انجام ہوتا ہے کہ ہاتھ سے مال بھی دیا اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ اللہ کے ہاں کسی اجروثواب کا سوال ہی نہیں۔

﴿لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا﴾ ’’ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔‘‘

ایسے لوگ اپنے تئیں صدقہ وخیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

وہ ناشکروں اور منکرین نعمت کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا اور انہیں بامراد نہیں کرتا۔

اگلی آیت میں فوری تقابل (simultaneous contrast) کے طور پر ان لوگوں کے لیے بھی مثال بیان کی جارہی ہے جو واقعتاً اللہ تعالیٰ سے اجروثواب کی اُمید رکھتے ہوئے خلوص واخلاص سے خرچ کرتے ہیں۔

آیت ۲۶۵ ﴿وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ ’’اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی رضاجوئی کے لیے‘‘

﴿وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ’’اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے‘‘

﴿کَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ﴾ ’’اُس باغ کی مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو‘‘

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ قدرتی باغ کا یہی تصور ہوتا تھا کہ ذرا اونچائی پر واقع ہے‘ اس کے دامن میں کوئی ندی بہہ رہی ہے جس سے خودبخود آب پاشی ہو رہی ہے اور وہ سیراب ہو رہا ہے۔ [قادیانیوں نے اسی لفظ ’’ربوہ‘‘ کے نام پر پاکستان میں اپنا شہر بنایا۔]

﴿اَصَابَهَا وَابِلٌ﴾ ’’اب اگر اس باغ کے اوپر زوردار بارش برسے‘‘

﴿فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِ ۚ﴾ ''تو دوگنا پھل لائے۔''

﴿فَاِنۡ لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ﴾ ''اوراگر زوردار بارش نہ بھی برسے تو ہلکی سی پھوار (ہی اس کے لیے کافی ہو جائے)۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۲۶۵﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو' اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔''

لٰہذا تم دروں بینی (intro spection) کرتے رہا کرو کہ تم جو یہ مال خرچ کر رہے ہو واقعتاً خلوصِ دل اور اخلاصِ نیت کے ساتھ اللہ ہی کے لیے کر رہے ہو۔ کہیں غیر شعوری طور پر تمہارا کوئی اور جذبہ اس میں شامل نہ ہو جائے۔ چنانچہ اپنے گریبانوں میں جھانکتے رہو۔

آیت ۲۶۶ ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِيۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' جس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں''

اہل عرب کے نزدیک یہ ایک آئیڈیل باغ کا نقشہ ہے' جس میں کھجور کے درخت بھی ہوں اور انگور کی بیلیں بھی ہوں' پھر اس میں آب پاشی کا قدرتی انتظام ہو۔

﴿لَهٗ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ﴾ ''اس کے لیے اس باغ میں ہر طرح کے پھل ہوں''

﴿وَاَصَابَهُ الۡكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ﴾ ''اور اس پر بڑھاپا طاری ہو جائے جبکہ اس کی اولاد ابھی ناتواں ہو۔''

﴿فَاَصَابَهَآ اِعۡصَارٌ فِيۡهِ نَارٌ فَاحۡتَرَقَتۡ ؕ﴾ ''اور عین اُس وقت اُس باغ پر ایک ایسا بگولا پھر جائے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جھلس کر رہ جائے؟''

یعنی ایک انسان ساری عمر یہ سمجھتا رہا کہ میں نے تو نیکیوں کے انبار لگائے ہیں' میں نے خیراتی ادارے قائم کیے' میں نے فاؤنڈیشن بنائی' میں نے مدرسہ قائم کیا' میں نے یتیم خانہ بنادیا' لیکن جب اُس کا نامۂ اعمال پیش ہوگا تو اچانک اسے معلوم ہوگا کہ یہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ ع ''جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!'' بس بادِسموم کا ایک بگولا آیا اور سب کچھ جلا گیا۔ اس لیے کہ اس میں اخلاص تھا ہی نہیں' نیت میں کھوٹ تھا' اس میں ریاکاری تھی' لوگوں کو دکھانا مقصود تھا۔ پھر اس کا حال وہی ہوگا جس طرح کہ وہ بوڑھا اب کفِ افسوس مل رہا ہے جس کا

*

5

باغ جل کر خاک ہو گیا اور اس کے کمسن بچے ابھی کسی لائق نہیں۔ وہ خود بوڑھا ہو چکا ہے اور اب دوبارہ باغ نہیں لگا سکتا۔ اس شخص کی مہلت عمر بھی ختم ہو چکی ہو گی اور سوائے کفِ افسوس ملنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہ ہو گا۔

﴿کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ﴾ ''اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو۔''

آیت ۲۶۷ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ﴾ ''اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو۔''

اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا ہے' اللہ کے نام پر دینا ہے تو جو کچھ تم نے کمایا ہے اس میں سے اچھی چیز' پاکیزہ چیز' بہتر چیز نکالو۔

﴿وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ ''اور اس میں سے خرچ کرو جو کچھ ہم نے نکالا ہے تمہارے لیے زمین سے۔''

ظاہر بات ہے کہ زمین سے جو بھی نباتات باہر آ رہی ہیں ان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ چاہے کوئی چراگاہ ہے تو اس کے اندر جو ہریاول ہے وہ اللہ ہی نے پیدا کی ہے۔ کھیت کے اندر آپ نے محنت کی ہے' ہل چلایا ہے' بیج ڈالے ہیں' لیکن فصل کا اُگانا تو آپ کے اختیار میں نہیں ہے' یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ع ''پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟'' چنانچہ فرمایا کہ جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اُس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو!

﴿وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ ''اور اس میں سے ردی مال کا ارادہ نہ کرو کہ اسے خرچ کر دو!''

ایسا نہ ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ردّی اور ناکارہ مال چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو۔ مثلاً بھیڑ بکریوں کا غلہ ہے' اس میں سے تمہیں زکوٰۃ کے لیے بھیڑیں اور بکریاں نکالنی ہیں تو ایسا ہرگز نہ ہو کہ جو کمزور ہیں' ذرا لاغر ہیں' بیمار ہیں' نقص والی ہیں انہیں نکال کر گنتی پوری کر دو۔ اسی طرح عُشر نکالنا ہے تو ایسا نہ کرو کہ گندم کے جس حصے پر بارش پڑ گئی تھی وہ نکال دو۔ تیمّم کے معنی قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں۔

﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ﴾ ''اور تم ہرگز نہیں ہو گے اس کو لینے

والے (اگر وہ شے تم کو دی جائے) الّا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔‘‘

ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم محتاج ہو جاؤ اور تمہیں ضرورت پڑ جائے‘ پھر اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے گا تو تم قبول نہیں کرو گے‘ اِلّا یہ کہ چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ احتیاج اس درجے کی ہو کہ نفیس یا خبیث جو شے بھی مل جائے چشم پوشی کرتے ہوئے اسے قبول کر لو۔ ورنہ آدمی اپنے طیب خاطر کے ساتھ ردّی شے قبول نہیں کر سکتا۔

﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۲۶۷﴾﴾ ’’اور خوب جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حمید ہے۔‘‘

یہاں ’’غنی‘‘ کا لفظ دوبارہ آیا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم کسی محتاج اور ضرورت مند کو دے رہے ہو‘ بلکہ یوں سمجھو کہ اللہ کو دے رہے ہو‘ جو غنی ہے‘ سب کی ضرورتیں پوری کرنے والا ہے اور حمید ہے‘ یعنی اپنی ذات میں خود محمود ہے۔ ایک تو کسی شے کی اچھائی یا حسن یا کمال ایسا ہوتا ہے کہ جسے ظاہر کیا جائے کہ بھئی دیکھو اس میں یہ خوبصورتی ہے۔ اور ایک وہ خوبصورتی ہوتی ہے جو ازخود ظاہر ہو۔ ع ’’حاجت مشاطہ نیست روئے دل آرام را!‘‘ تو اللہ تعالیٰ اتنا ستودہ صفات ہے کہ وہ اپنی ذات میں ازخود محمود ہے‘ اسے کسی حمد کی حاجت نہیں ہے۔

آیت ۲۶۸ ﴿اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَیَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ﴾ ’’شیطان تمہیں فقر کا اندیشہ دلاتا ہے اور بے حیائی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَفَضۡلًا ؕ﴾ ’’اور اللہ وعدہ کر رہا ہے تم سے اپنی طرف سے مغفرت کا اور فضل کا۔‘‘

اب دیکھ لو‘ تمہیں کون سا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے: ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!‘‘

شیطان تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے کہ اس طرح تمہارا مال کم ہو جائے گا اور تم فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اب اگر واقعی تم یہ خوف رکھتے ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر فقر آ جائے‘ لہٰذا مجھے اپنا مال سنبھال سنبھال کر‘ سینت سینت کر رکھنا چاہیے تو تم شیطان کے جال میں پھنس چکے ہو‘ تم اس کی پیروی کر رہے ہو۔ اور اگر تم نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے کہ وہ میری ساری حاجتیں آج بھی پوری کر رہا ہے‘ کل بھی پوری

کرے گا (اِن شاء اللہ) تو اللہ کی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾﴾ ''اللہ بہت وسعت والا ہے' سب کچھ جاننے والا ہے۔''
تم اس کے خزانوں کی محدودیت کا کوئی تصور اپنے ذہن میں نہ رکھو۔

آیت ۲۶۹ ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔''
یہ حکمت کی باتیں ہیں' جن کا سمجھنا ہر کس و نا کس کے لیے ممکن نہیں۔ ایک چیزوں کا ظاہر ہے اور ایک باطن ہے' جو حکمت سے نظر آتا ہے۔ ظاہر تو سب کو نظر آ رہا ہے' لیکن کسی شے کی حقیقت کیا ہے' یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے:

اے اہل نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

جس کسی پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے وہ حکیم ہے۔ اور حکمت اصل میں انسان کی عقل اور شعور کی پختگی کا نام ہے۔ استحکام اسی ''حکمت'' سے ہی بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ عقل و فہم اور شعور کی یہ پختگی اور حقائق تک پہنچ جانے کی صلاحیت جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ''اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا۔''

اس سے بڑا خیر کا خزانہ تو اور کوئی ہے ہی نہیں۔

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾﴾ ''اور نہیں نصیحت حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو ہوش مند ہیں۔''

ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو اولوا الالباب ہیں' عقل مند ہیں۔ لیکن جو دنیا پر ریجھ گئے ہیں' جن کا سارا دلی اطمینان اپنے مال و زر' جائیداد' اثاثہ جات اور بینک بیلنس پر ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ اولوا الالباب (عقل مند) نہیں ہیں۔

آیت ۲۷۰ ﴿وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ﴾ ''اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو (صدقہ و خیرات دیتے ہو) یا جو بھی تم (اللہ کے نام پر) منت مانتے ہو' تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس سب کو جانتا ہے۔''

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾﴾ ''اور (یاد رکھو کہ) ظالموں کا کوئی

مددگار نہیں ہوگا۔‘‘

آیت ۲۷۱ ﴿اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ھِیَ ۚ﴾ ’’اگر تم صدقات کو علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے‘‘۔

خاص طور پر زکوٰۃ کا معاملہ تو علانیہ ہی ہے۔ تو اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ کم سے کم فقراء کا حق تو ادا ہو گیا‘ کسی کی ضرورت تو پوری ہو گئی۔

﴿وَاِنۡ تُخۡفُوۡھَا وَتُؤۡتُوۡھَا الۡفُقَرَآءَ فَھُوَ خَیۡرٌ لَّـکُمۡ ؕ﴾ ’’اور اگر تم انہیں چھپاؤ اور چپکے سے ضرورت مندوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔‘‘

یاد رہے کہ یہ بات صدقاتِ نافلہ کے لیے ہے۔ لیکن جو صدقات واجبہ ہیں‘ جو لازماً دینے ہیں‘ مثلاً زکوٰۃ اور عشر‘ ان کے لیے اخفاء نہیں ہے۔ یہ دین کی حکمت ہے‘ اس کو ذہن میں رکھیے کہ فرض عبادات علانیہ ادا کی جائیں گی۔ یہ وسوسہ بھی شیطان بہت سوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے کہ کیا پانچ وقت مسجد میں جا کر نماز پڑھنے سے لوگوں پر اپنے تقویٰ کا رعب ڈالنا چاہتے ہو؟ گھر میں پڑھ لیا کرو! یا داڑھی اس لیے رکھو گے کہ لوگ تمہیں سمجھیں کہ بڑا متقی ہے؟ ایسے وساوسِ شیطانی کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے اور جو چیز فرض و واجب ہے‘ وہ علی الاعلان کرنی چاہیے‘ اس کے اظہار میں کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔ ہاں جو نفلی عبادات ہیں‘ صدقاتِ نافلہ ہیں یا نفل نماز ہے اسے چھپا کر کرنا چاہیے۔ نفل عبادت کا اظہار بہت بڑا فتنہ ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اگر تم اپنے صدقات چھپا کر چپکے سے ضرورت مندوں کو دے دو تو وہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔

﴿وَیُکَفِّرُ عَنۡکُمۡ مِّنۡ سَیِّاٰتِکُمۡ ؕ﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دور کر دے گا۔‘‘

﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۲۷۱﴾﴾ ’’اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔‘‘

آیت ۲۷۲ ﴿لَیۡسَ عَلَیۡکَ ھُدٰىھُمۡ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کے ذمہ نہیں ہے کہ ان کو ہدایت دے دیں‘‘

ان کو ہدایت دینے کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے‘ آپؐ پر ذمہ داری تبلیغ کی ہے۔ ہم نے

*

آپ کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

﴿وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ﴾ ''اور جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ تمہارے اپنے لیے بہتر ہے۔''

اس کا اجر و ثواب بڑھا چڑھا کر تمہی کو دیا جائے گا' سات سوگنا' چودہ سوگنا یا اس سے بھی زیادہ۔

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور تم نہیں خرچ کرو گے مگر اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔''

تبھی تمہیں اس قدر اجر ملے گا۔ اگر ریا کارانہ خرچ کیا تھا تو اجر کا کیا سوال؟ وہ تو شرک بن جائے گا۔

﴿وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾﴾ ''اور جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں لوٹا دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔''

تمہاری ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

اب واضح کیا جا رہا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا سب سے بڑھ کر حق دار کون ہے۔

آیت ۲۷۳ ﴿لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ ''یہ ان ضرورت مندوں کے لیے ہے جو گھر کر رہ گئے ہیں اللہ کی راہ میں''

جیسے رسول اللہ ﷺ کے دور میں اصحابِ صفہ تھے کہ مسجد نبویؐ میں آ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنا وقت تلاشِ معاش میں صرف نہیں کر رہے' آنحضور ﷺ سے علم سیکھ رہے ہیں اور جہاں جہاں سے مطالبہ آ رہا ہے کہ معلمین اور مبلغین کی ضرورت ہے وہاں ان کو بھیجا جا رہا ہے۔ اگر وہ معاش کی جدوجہد کرتے تو یہ تعلیم کیسے حاصل کرتے؟ اسی طرح دین کی کسی خدمت کے لیے کچھ لوگ اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں تو وہ اس کا مصداق ہوں گے۔ آپ نے دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لیے کوئی تحریک اٹھائی ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ ہمہ وقتی کارکن درکار ہوں گے۔ ان کارکنوں کی معاش کا مسئلہ ہوگا۔ وہ آٹھ آٹھ گھنٹے دفتروں میں جا کر کام کریں اور وہاں افسروں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سنیں' آنے جانے میں بھی دو دو گھنٹے لگائیں تو اب وہ دین کے کام کے لیے کون سا وقت نکالیں گے اور کیا کام کریں گے؟ لہٰذا کچھ لوگ تو ہونے چاہئیں جو اس

کام میں ہمہ وقت لگ جائیں۔لیکن پیٹ تو ان کے ساتھ بھی ہیں، اولاد تو ان کی بھی ہوگی۔

﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾ ''وہ (اپنے کسب معاش کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔''

زمین کے اندر گھوم پھر کر تجارت کرنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ ''ناواقف آدمی ان کو خوشحال خیال کرتا ہے ان کی خودداری کے سبب۔''

یہ اس طرح کے فقیر تو ہیں نہیں جو لپٹ کر مانگتے ہوں۔ان کی خودداری کی وجہ سے عام طور پر جو ناواقف شخص ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ غنی ہیں، خوشحال ہیں، انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں، انہوں نے کبھی مانگا ہی نہیں۔لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح کے سوالی نہیں ہیں، وہ فقیر نہیں ہیں، انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے اپنے آپ کو لگا دیا ہے۔ یہ تمہارا کام ہے کہ انہیں تلاش کرو اور ان کی ضروریات پوری کرو۔

﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ ''تم پہچان لو گے انہیں ان کے چہروں سے۔''

ظاہر بات ہے کہ فقر و احتیاج کا اثر چہرے پر تو آ جاتا ہے۔اگر کسی کو صحیح غذا نہیں مل رہی ہے تو چہرے پر اس کا اثر ظاہر ہوگا۔

﴿لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا﴾ ''وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔''

وہ ان سائلوں کی طرح نہیں ہیں جو اصل میں اپنی محنت کا صلہ وصول کرتے ہیں کہ آپ کے سر ہو کر آپ سے زبردستی کچھ نہ کچھ نکلوا لیتے ہیں۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جو لوگ ہمہ وقت لگ جائیں، آخر ان کے لیے ذریعۂ معاش کیا ہو؟ اس وقت اس پر تفصیل سے گفتگو ممکن نہیں۔ بہرحال یہ سمجھ لیجیے کہ یہ دو رکوع انفاق کے موضوع پر قرآن حکیم کا نقطۂ عروج ہیں اور یہ آخری آیت ان میں اہم ترین ہے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾﴾ ''اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔''

یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا انفاق اللہ کے علم میں نہیں ہے۔تم خاموشی کے ساتھ، اخفاء کے ساتھ لوگوں کے ساتھ تعاون کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بھرپور بدلہ دے گا۔OO

*

1

منبر و محراب

اسلام، ایمان اور احسان

حدیثِ جبریلؑ کی روشنی میں (۴)

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی لاہور میں

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۲۹ جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ——— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْھَہٗٓ اِلَی اللّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ط﴾ (لقمٰن:۲۲)

﴿بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ (البقرۃ)

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ط﴾ (النساء:۱۲۵)

﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۹۳﴾﴾ (المائدۃ)

آج بھی ’’حدیث جبریلؑ‘‘ ہمارے زیر مطالعہ ہے اور اس سے قبل تین نشستوں میں اس پر گفتگو ہو چکی ہے، جن میں ہم نے اس کے اہم ترین حصے کا مطالعہ کر لیا ہے۔ ذرا

پس منظر کو ذہن میں لے آیئے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے بال انتہائی سیاہ اور کپڑے انتہائی سفید تھے' اس پر سفر کے کوئی آثار نہیں تھے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی اُس سے واقف تھا۔ بہرحال وہ شخص بڑھتا چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے عین سامنے جا کر بیٹھ گیا' آپؐ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیے اور آپؐ کے زانوؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ اس شخص نے آپؐ سے کچھ سوالات کیے جن کے آپؐ نے جوابات دیے۔ جب وہ شخص روانہ ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اے عمر! تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کون تھا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: ((**فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ' اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ**)) ''یہ جبریلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اکرم ﷺ سے پہلا سوال کیا: **يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ!** ''اے محمد (ﷺ)! مجھے بتایئے کہ اسلام کیا ہے''۔ آپؐ نے جواب دیا تو جبریلؑ نے تصدیق و توثیق کرتے ہوئے کہا: **صَدَقْتَ** ''آپ ﷺ نے سچ فرمایا''۔ انہوں نے دوسرا سوال کیا: **فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ!** ''مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے!'' آپ ﷺ نے اس کا جواب دیا تو انہوں نے کہا: **صَدَقْتَ** ''آپؐ نے سچ فرمایا''۔ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے تیسرا سوال کیا: **فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ!** ''مجھے احسان کے بارے میں بتایئے''۔ آپؐ نے فرمایا: ((**اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ**)) ''اس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرنا گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ ہم ''اسلام'' اور ''ایمان'' پر تو گزشتہ نشستوں میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں اور آج کی نشست میں ہمارا موضوع یہی ''احسان'' ہے۔

''احسان'' کا لفظ ''حُسن'' سے بنا ہے جو کہ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ حسن کے معنی ہیں خوبصورتی' عمدگی' موزونیت۔ اور احسان کے معنی ہیں کسی کو

حسین بنانا۔ حَسُنَ، یَحْسُنُ کے معنی ہیں حسین ہونا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی تعریف میں کہا گیا ہے :حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ ''آپ ؐ کی تو تمام ہی عادات نہایت حسین تھیں''۔اور اَحْسَنَ، یُحْسِنُ کے معنی ہیں کسی کو حسین بنانا۔''احسان'' کو لفظی اعتبار سے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے تاکہ اس کی اصل حقیقت واضح ہوجائے' اس لیے کہ بدقسمتی سے احسان کی جگہ ہمارے ہاں ''تصوف'' کا لفظ معروف ہوگیا ہے' اور اتنا معروف ہوا ہے کہ اس نے لفظ ''احسان'' کو گویا ہماری لغت سے ہی خارج کردیا ہے۔

احسان کے ایک لفظی معنی ہیں کسی پر بھلائی کرنا۔ سورۃ القصص میں ہے کہ لوگوں نے قارون سے کہا تھا کہ:﴿وَاَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ﴾(آیت ۷۷)''اور تم بھی لوگوں کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرو جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ اچھائی کی ہے''۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت مند بنایا ہے تو تم بھی لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے' ان کی مدد میں اپنے مال میں سے خرچ کرو۔تو احسان کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا' بھلائی کرنا۔لیکن ہوا یہ ہے کہ لفظ تصوف نے آ کر احسان کے اس اصلی اور بنیادی معنی کو ذہنوں سے بالکل نکال دیا ہے اور ہمارے ذہنوں میں سارا مواد لفظ تصوف کے حوالے سے ہے۔ حالانکہ تصوف کا لفظ نہ قرآن مجید میں آیا ہے نہ حدیث میں ۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے تقریباً دوسو برس بعد تک یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ڈاکٹر میر ولی الدین ایک بہت بڑے مصنف اور مفکر و فلسفی تھے' حیدرآباد دکن کی جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فلسفہ کے ہیڈ تھے اور ''قرآن اور تصوف'' کے عنوان سے ان کی کتاب بھی ہے' انہوں نے اس لفظ پر تحقیق کی ہے اور رسالہ قشیریہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ لفظ پہلی مرتبہ ۸۲۲ء (بمطابق ۲۰۰ھ) میں یعنی آنحضور ﷺ کے انتقال کے ۱۹۰ برس بعد استعمال ہوا ہے' اس لیے کہ آپ ؐ کا انتقال ۶۳۲ء میں ہوا ہے۔ ان کے خیال میں اس لفظ ''تصوف'' کے بارے میں یہ بھی اتفاق نہیں ہوسکا کہ اس کا مادہ کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ صفا سے بنا ہے' کسی کے خیال میں صَف سے بنا ہے اور کسی کی رائے ہے کہ یہ صُفہ سے بنا ہے۔ لیکن ڈاکٹر میر ولی الدین کی رائے میں یہ تمام امکانات قطعاً غلط ہیں۔ ان

کے خیال میں یہ صرف لفظ ''صُوف'' سے بنا ہے' جس کے معنی ''اُون'' کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دَور میں آ کر جن لوگوں نے روحانیت کے میدان کو اپنی جولان گاہ بنایا تو انہوں نے اُونی لباس پہننا شروع کر دیا تاکہ جسم کو چبھے اور اسے بجائے راحت دینے کے تکلیف پہنچائے۔ دراصل روحانیت اور باطنیت (mysticism) کے میدان میں' چاہے وہ Hindi mysticism ہو' چاہے Christian mysticism ہو' چاہے New Platonism ہو' یہ چیز لازم ہوتی ہے کہ اپنے نفس کو تکلیف اور ایذا پہنچاؤ۔ تو اُن کے خیال میں اس ''صُوف'' سے لفظ ''صوفی'' بنا ہے۔ واللہ اعلم!

لفظ تصوف کے بارے میں ایک اور تصور بھی رہا ہے' جس کی اگرچہ این میری شمل نے بڑی تردید کی ہے' لیکن میرا گمان یہی ہے کہ لفظ ''تصوف'' کا ماخذ یونانی لفظ ''sophia'' ہے' جس کے معنی ہیں حکمت۔ چنانچہ فلاسفی (Philosophy) کا لفظ جو ہمارے ہاں معروف ہے' وہ اصل میں ''فائلوسوفی'' ہے جس کے معنی ہیں وہ حکمت جو منطق پر مبنی ہو۔ ایسے ہی تھیوسوفی (Theosophy) کا مطلب ہے حکمت دین' معرفت خداوندی کا علم یا بالفاظِ دیگر وجدان۔ یعنی ایک تو مذہب کا عوامی اور عملی پہلو ہے اور ایک ہے اس کا علمی' فکری اور باطنی پہلو۔ آج بھی کراچی میں بندر روڈ پر تھیوسوفیکل ہال ہے۔ ایسے ہی دنیا میں Theosophical Societies رہی ہیں تاکہ تمام مذاہب کے اندر جو باطنی حکمت ہے اس کو ایک قدرِ مشترک کے طور پر سامنے لایا جائے۔

بہرحال ''احسان'' کے معنی کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی ہیں اور کسی شے کو حسین بنانا بھی۔ اب میں حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث نبوی پیش کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ))(۱) ''یقیناً اللہ نے ہر چیز کے بارے میں واجب کیا ہے کہ اس میں خوبصورتی پیدا کی جائے۔'' اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دی کہ: ((فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَأَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ)) ''پس جب تمہیں کسی کو قتل کرنا ہو تو خوبصورتی کے ساتھ قتل کرو۔'' قتل کے اندر خوبصورتی

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصید والذبائح وما یوکل من الحیوان۔

*

3

سے یہ مراد ہے کہ اگر کوئی شخص شریعت کی گرفت میں آ گیا ہے' اس پر قتل کی حد نافذ ہوگئی ہے تو اسے اس انداز اور طریقے سے قتل کیا جائے کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو۔ قرونِ اولیٰ میں جبکہ اسلامی ریاست اپنی آب وتاب کے ساتھ قائم تھی' پیشہ ور جلاد ہوتے تھے جو اپنے اس فن میں ماہر تھے اور وہ تیز دھار آلے سے ایک ہی وار میں گردن کو تن سے جدا کر دیتے تھے جس سے تکلیف کم سے کم ہوتی تھی۔ اب بھی سعودی عرب میں اسلامی سزائیں نافذ ہیں اور سزا کے طور پر سر قلم ہوتے ہیں تو اِس کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ پیشہ ور جلاد تیز دھار آلے سے ایک ہی وار میں گردن اڑا دیتے ہیں۔ حدیث کے اگلے ٹکڑے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ)) ''اور جب (کسی جانور کو) ذبح کرنے لگو تو خوبصورتی اور عمدگی سے ذبح کرو''۔ اور اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ: ((وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهُ فَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ)) ''اور تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ ذبح کرتے وقت اپنی چھری کو تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچائے (اسے زیادہ تکلیف نہ ہونے دے)۔'' اگر کند چھری سے جانور کو ذبح کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ذبیحے کو یقیناً بہت زیادہ تکلیف ہوگی جبکہ تیز دھار والی چھری کے ساتھ ایک ہی وار میں جانور ذبح ہو جائے گا اور اسے تکلیف کم سے کم ہوگی۔

بہر حال آپ کے سامنے احسان کے لفظی معنی آ گئے ہیں۔ اسی سے قرآن مجید کی اصطلاح ہے ''احسانِ اسلام'' یعنی اسلام میں خوبصورتی پیدا کرنا۔ ایک شخص کا اسلام تو یہ ہے کہ وہ محض مارے باندھے کے فرائض مثلاً نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ادا کر رہا ہے۔ اس میں اس کی دلی آمادگی اور دلی جذبہ شامل نہیں ہے۔ منہیات کے معاملے میں بھی بے دلی اور تھڑدلے پن کے ساتھ' طبیعت کی عدم آمادگی سے محض خانہ پوری کر رہا ہے' جبکہ ایک شخص پورے اہتمام اور توجہ کے ساتھ اور دل کی پوری آمادگی سے فرائض انجام دے رہا ہے' نواہی سے طبیعت کی پوری آمادگی کے ساتھ احتراز کر رہا ہے' نفلی عبادات پر بھی بھرپور توجہ ہے تو گویا اس کا اسلام درجۂ احسان کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے لیے میں نے ''احسانِ اسلام'' کی اصطلاح استعمال کی ہے' یا اسے ''سلوکِ محمدیؐ'' بھی کہا جا سکتا

ہے۔ اسی حوالے سے میں نے آغازِ خطاب میں قرآن مجید کے مختلف مقامات سے تین آیات تلاوت کی ہیں۔ ان میں سے ایک سورۂ لقمان کی آیت ہے جو مکی سورت ہے۔ فرمایا گیا:

﴿وَمَنۡ یُّسۡلِمۡ وَجۡهَهٗۤ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰی ؕ﴾ (لقمٰن:۲۲)

’’جو شخص اپنے چہرے کو اللہ کے سامنے جھکا دے (اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے) اور وہ محسن ہو تو اُس شخص نے فی الواقع مضبوط حلقے کو تھام لیا‘‘۔

العُروۃ الوُثقیٰ یعنی مضبوط حلقہ یا کنڈا پکڑنے سے کیا مراد ہے‘ اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا ہو اور وہ سمندر میں گر پڑے‘ اسے تیرنا بھی نہ آتا ہو‘ لیکن اس شخص کے ہاتھ میں جہاز کا کوئی کنڈا آ جائے تو یقیناً وہ یہی سمجھے گا کہ اب یہ کنڈا ہی اس کی جان ہے‘ اس کنڈے کو اُس نے چھوڑا تو وہ ڈوب جائے گا اور اگر اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو بچنے کا امکان موجود ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اسلام اور احسان کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس شخص کا اسلام مارے باندھے اور زبردستی کا نہیں ہے‘ بلکہ وہ دلی آمادگی کے ساتھ شریعت کے اوامر و نواہی پر کاربند ہے۔ اگرچہ مارے باندھے کے اسلام کو بھی قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص کلمہ پڑھ رہا ہے تو آپ اسے قتل نہیں کر سکتے‘ اِلّا یہ کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو کہ اس کی بنا پر اس کی سزا قتل ہو یا یہ کہ اس کا مرتد ہونا ثابت ہو جائے‘ بصورتِ دیگر اسلام اس کے لیے ڈھال ہے۔ اس کے بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں کہ عین حالتِ جنگ میں بھی اگر ایک کافر یہ محسوس کرے کہ اب میں بے بس ہو گیا ہوں‘ لہٰذا وہ کلمہ پڑھ دے تو پھر بھی آپ اس کو اپنے گمانِ غالب کی بنا پر‘ کہ اس نے صرف جان بچانے کے لیے یہ حیلہ کیا ہے‘ قتل نہیں کر سکتے۔ اس کا کلمہ اس کے پاس ڈھال ہے۔ تو قانونی سطح پر اسلام کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے‘ لیکن اصل اسلام جو مطلوب ہے وہ احسان والا اسلام ہے‘ یعنی اس میں خوبصورتی ہو‘ اس میں طبیعت کی پوری آمادگی ہو۔

*

پورے انہماک کے ساتھ، اپنی امکانی جدوجہد کے ساتھ ان کاموں کو انجام دیا جائے۔

دوسرا مقام سورۃ البقرۃ کی آیت ہے:

﴿بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۱۱۲﴾﴾

''کیوں نہیں، جس شخص نے اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دیا (سر تسلیم خم کر دیا) اور وہ ہوا محسن (یعنی اس نے بہت عمدگی اور دلی آمادگی کے ساتھ، بہتر سے بہتر انداز میں اوامر ونواہی کا خیال رکھا) تو اس کے لیے یقیناً اس کا اجر اس کے ربّ کے پاس محفوظ ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس ضمن میں تیسرا مقام سورۃ النساء کا ہے، جہاں فرمایا گیا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ......﴾ (آیت ۱۲۵)

''اور اُس شخص سے بہتر دین کس کا ہوگا جس نے اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دیا (سر تسلیم خم کر دیا) اور وہ بھی احسان کی کیفیت کے ساتھ......''

مذکورہ بالا آیات میں بھی دیکھئے کہ اسلام اور احسان کو جوڑ دیا گیا ہے۔ حدیث زیر مطالعہ میں ''اسلام'' اور ''احسان'' کے درمیان ''ایمان'' کا ذکر ہے۔ حضرت جبریلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے پہلا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ! دوسرا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ! اور پھر اگلا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ! یہ وہی بات ہے جو سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ میں آئی ہے کہ:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۹۳﴾﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی جبکہ ان کا طرزِ عمل یہ رہا ہو کہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی اور ایمان لائے اور عمل صالح کیے، پھر مزید تقویٰ کا اضافہ کیا اور ایمان

لائے‘ پھر مزید تقویٰ اختیار کیا اور احسان کی روش اختیار کی۔ اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے۔‘‘

یہاں تین درجے آ رہے ہیں: اسلام‘ ایمان اور احسان۔ اور حدیث زیر مطالعہ میں بھی یہی تین درجے ہیں: اسلام‘ ایمان اور احسان۔

اب یہاں دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ نے احسان کی کیا تعریف بیان فرمائی۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے استفسار کیا: **فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ!** ’’اب آپ مجھے احسان کے بارے میں بتایئے‘‘۔ تو آپ ؐ نے جواب ارشاد فرمایا: ((**اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ، فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ**)) ’’کیفیت میں اللہ کی بندگی کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے‘‘۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ انہی کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ ہیں: ((**اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ تَعَالٰی کَاَنَّکَ تَرَاہُ ، فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ**)) ’’تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اِس کیفیت میں گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔‘‘ اور حبر الاُمّہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ ہیں: ((**اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ......**)) ’’کہ تو عمل کرے اللہ کے لیے (یا محنت کرے اللہ کے لیے)......‘‘ یہ تین الفاظ ذہن میں رکھئے: **اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ ، اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ ، اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ** . حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت‘ جو کہ حدیث جبریلؑ کا مقبولِ عام version ہے‘ اس میں لفظ ’’عبادت‘‘ آیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں عوامی سطح پر عبادت کا محدود تصور ہے لہٰذا یہ لفظ اس حدیث کو سمجھنے میں حجاب بن گیا ہے۔ عوامی سطح پر عبادت کا تصور محض نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ تک محدود ہے‘ اور ’’احسان‘‘ انہی چیزوں کے ساتھ مقید ہو کر رہ گیا ہے کہ بس نماز بہتر سے بہتر ہو اور بڑی عمدگی سے پڑھی جائے۔ اس میں خشوع و خضوع ہو‘ تعدیلِ ارکان کا لحاظ رکھا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی دیگر عبادات خوش اسلوبی سے ادا کی

*

5

جائیں اور بس۔ احسان کو صرف عبادات تک محدود کر دینے سے اس حدیث کے عموم میں مجوبیت پیدا ہو سکتی تھی، مگر اللہ کا شکر ہے کہ دیگر دو روایتوں کے اندر اس کا مفہوم کھل کر سامنے آ رہا ہے۔

چنانچہ اس حدیث میں عبادت کا مفہوم صرف عبادات تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ہمہ گیر ہے، البتہ اس میں عبادات بھی شامل ہیں۔ دراصل عبد کے معنی غلام کے ہیں اور غلامی میں آقا کی ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ جہت اطاعت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ غلام مملوک ہوتا ہے، ملازم (employee) نہیں ہوتا کہ اس نے اتنے گھنٹے کام کرنا ہے، باقی اوقات میں وہ آزاد ہے۔ لہٰذا عبادت اور بندگی میں employee اور employer کا تعلق ذہن سے نکال دیجیے! ملازم تو کہہ سکتا ہے کہ آپ نے مجھے باورچی کی حیثیت سے ملازم رکھا ہے لہٰذا میں آپ کے گھر کی صفائی نہیں کروں گا۔ لیکن غلام تو اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے، لہٰذا وہ اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فلاں کام تو کروں گا لیکن فلاں کام نہیں کروں گا۔ اسے تو ہمہ وقت، ہمہ تن اور ہمہ جہت اطاعت کرنی ہے۔ سورۃ الذّٰریٰت میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝۵۶﴾ ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جن اور انسانوں کو مگر اپنی عبادت (ہر آن بندگی) کے لیے۔'' شیخ سعدیؒ نے اپنے ایک شعر میں اس آیت کی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی!

دوسری چیز جو اِس عبادت کا لازمی حصہ ہے وہ عبادت میں ''محبت'' کا عنصر ہے۔ یعنی عبادتِ الٰہی کا مطلب ہے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر ہمہ تن اور ہمہ جہت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا۔ اس کے لیے فارسی کا ایک لفظ ہے ''بندگی'' اور ایک ہے ''پرستش''۔ ان دونوں کو جمع کریں گے تو عبادت بنے گی۔ بہرحال عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی عبادت نہیں ہیں، البتہ یہ عبادت میں شامل ضرور ہیں۔ یہ عبادت یعنی ہر آن بندگی کے لیے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس کے لیے مددفراہم کرتی ہیں۔ اس

لیے کہ عبادت یعنی ہمہ تن‘ ہمہ وقت اور ہمہ جہت اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے مدد کی ضرورت ہے۔ نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج اسی کام کے لیے مدد فراہم کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ احسان یہ ہے کہ تم اِس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرو‘ یا بالفاظِ دیگر اس کیفیت میں اللہ سے ڈرو‘ اس کی راہ میں جدوجہد اور بھاگ دوڑ کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ اصل میں ایمان و یقین کی انتہائی کیفیت کا نام ہے۔ ایمان درحقیقت بِالْغَیْبِ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے تو نہیں ہے‘ البتہ ہمارے پاس ضرور ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾﴾ (قٓ) ”اور ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں“۔ لیکن غیب کا ایک پردہ حائل ہے۔ دراصل حدیث زیر مطالعہ میں ایمان کی شدت اور اس کی ایک جہت (dimension) بیان ہو رہی ہے کہ ایمان کی گہرائی اتنی شدید ہو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ یہاں الفاظ آئے ہیں: کَاَنَّکَ تَرَاہُ ”گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو“۔ اس لیے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مکالمے کا شرف نصیب فرمایا تو انہوں نے مکالمے کے دوران استدعا کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ؕ﴾ (الاعراف:۱۴۳) ”اے پروردگار! تو مجھ کو یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں (یعنی مجھے اپنا دیدار نصیب فرما)۔“ تو جواب ملا: ﴿لَنْ تَرٰىنِیْ﴾ ”تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے“۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آپؐ نے شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں۔ قرآن مجید میں تو یہی ہے کہ: ﴿لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی ﴿۱۸﴾﴾ (النجم) ”اُس نے اپنے ربّ کی عظیم ترین آیات کا مشاہدہ کیا“۔ لیکن بہرحال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک رائے یہ موجود ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہی ہے‘ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ نہیں ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب پوچھا گیا کہ کیا رسول اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا؟ تو

آپؐ نے بہت خوبصورت الفاظ میں فرمایا: نُورٌ اَنّٰی یُرٰی؟ ’’وہ تو نور ہے‘ اسے دیکھا کیسے جائے گا؟‘‘ اس لیے کہ نور کے ذریعے سے تو آپ کسی چیز کو دیکھتے ہیں لیکن نور کو تو نہیں دیکھ سکتے! بہرحال کَاَنَّکَ تَرَاہُ سے مراد ہے اللہ پر‘ اس کے وجود اور اس کی حقیقت پر اِس قدر یقین ہو جائے جس قدر کسی چیز کو آنکھوں سے دیکھنے سے یقین پیدا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے جو اگلے الفاظ ہیں: ((فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) ’’پس اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی) تو (کم از کم یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔‘‘ تو اس ٹکڑے کے دو مفہوم لیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ پہلے ٹکڑے کی وضاحت ہے کہ اگرچہ تم اللہ کو نہیں دیکھ پاتے لیکن وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ یہ ایمان کا دوسرا درجہ ہے۔ اونچا درجہ تو یہی ہے کہ ایمان کے اندر اتنی شدت پیدا ہو جائے گویا کہ تم اللہ کو فی الواقع اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ لیکن اگر ایمان اس قدر حاصل نہ ہو سکے تو اس سے کم تر درجے میں یہ یقین ہو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یعنی یہ استحضار ہو کہ میں ہر آن اللہ کی نگاہ میں ہوں‘ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب فرماتے ہوئے کہا گیا: ﴿فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا﴾ (الطور:۴۸) ’’پس (اے نبیؐ!) آپ یقیناً ہماری نگاہوں میں ہیں‘‘۔ ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ بندۂ مؤمن کے لیے یہ کیفیت کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے‘ بہت حوصلہ افزا اور پُر مسرت ہوتی ہے۔ جب وہ کوئی نیک کام کر رہا ہوتا ہے‘ فی سبیل اللہ کوئی کام کر رہا ہوتا ہے‘ دین کی کوئی خدمت سرانجام دیتے ہوئے اس کے لیے بھوک پیاس برداشت کر رہا ہوتا ہے اور تکلیف جھیل رہا ہوتا ہے تو اُس وقت یہ احساس اس کے لیے اس قدر دلجوئی کا سامان فراہم کرتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے‘ میرا مالک جس کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں‘ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ع ’’مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی‘‘۔ ہم تو ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے اور انہیں پتا بھی نہیں چلا۔ نہیں‘ بلکہ میری ساری قربانیاں‘ محنتیں اور بھاگ دوڑ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

بہرحال کسی بندۂ مؤمن کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا

ہے‘ یہ بھی درجۂ احسان پر فائز ہونے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی آگے ایمان و یقین میں یہ گہرائی پیدا ہو جائے کہ بندۂ مؤمن کو یہ احساس ہو کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے تو یہ اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اس قسم کی باتیں کہی گئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپؐ فجر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لیے مسجد نبویؐ میں تشریف رکھتے تھے اور صحابہ کرامؓ سے کچھ گفتگو ہوتی تھی۔ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو بیان کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سوال و جواب بھی ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ایک صحابیؓ سے دریافت فرمایا: ((کَیْفَ اَصْبَحْتَ)) ”آج تمہیں کیسی صبح نصیب ہوئی ہے؟“ تو اُن کا جواب بڑا غیر معمولی تھا کہ: **اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ** صلی اللہ علیہ وسلم ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے تو آج سچے مؤمن کی صبح نصیب ہوئی ہے“۔ چونکہ یہ بات غیر معمولی تھی لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ((**لِکُلِّ شَیْءٍ صِفَتُہٗ فَمَا صِفَۃُ اِیْمَانِکَ؟**)) ”ہر شے کی کوئی نہ کوئی صفت ہوتی ہے (جس سے آدمی اس کو پہچانتا ہے) تو تمہارے ایمان کی کیا صفت ہے؟“ یعنی تم جو کہہ رہے ہو کہ مجھے سچے مؤمن کی صبح نصیب ہوئی ہے تو اس کی کیا کیفیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا: **کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَی الْجَنَّۃِ وَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَی النَّارِ** ”میرے یقین کی کیفیت یہ ہے گویا میں جنت کو دیکھ رہا ہوں اور جیسے میں جہنم کو دیکھ رہا ہوں“۔ لہٰذا اگر اللہ کے لیے جد و جہد اور بھاگ دوڑ کرتے ہوئے‘ اللہ سے ڈرتے ہوئے استحضار اللہ فی القلب کی کیفیت پیدا ہو جائے‘ عبادت میں حسن اور نکھار پیدا ہو جائے تو یہ درحقیقت ”احسانِ اسلام“ یا باصطلاحِ دیگر ”سلوکِ محمدیؐ“ ہے اور یہ دل میں یقین کی گہرائی سے پیدا ہوتا ہے۔

اب یوں سمجھئے کہ ہمارے سامنے تین درجے آ گئے۔ ایمان اگر صرف زبان پر آ جائے تو یہ ”اسلام“ ہے‘ اگر دل میں داخل ہو جائے تو یہ ”ایمان“ ہے اور اگر یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو ”احسان“ ہے۔ دل کی گہرائیوں کے بارے میں یہ جان لیجیے کہ اس کی گہرائیاں بہت اتھاہ ہیں۔ اور جسے ہم ”دل“ کہتے ہیں ایک تو یہ گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جس کا کام ہے خون پمپ کرنا۔ یہ پھیپھڑوں کی طرف سے صاف شدہ خون لے

کر پورے جسم کی طرف دھکیل دیتا ہے اور پورے جسم سے وہ خون لے کر جس کے اندر آلائشیں وغیرہ جمع ہوگئی ہوتی ہیں' پھیپھڑوں کی طرف دھکیل دیتا ہے' تاکہ وہاں اس کی صفائی ہو جائے۔ تو یہ دل جو گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' یہ محض پمپ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن دین کے اعتبار سے' قرآن کے اعتبار سے یہ اصل میں روحِ انسانی کا مرکز اور محل ہے' اور رُوح کا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست ہے۔ لہٰذا آپ اس قلب کی گہرائی ناپ نہیں سکتے۔ سلطان باہو نے بہت خوبصورت بات کہی ہے: ع ''دل دریا سمندروں ڈونگے' کون دلاں دیاں جانے ہُو!'' واقعۃً یہ دل دریاؤں اور سمندروں سے بھی زیادہ گہرا ہے۔ اور جب ایمان اس گہرائی میں جاگزیں ہو جائے تو یہ احسان ہے۔ احسان اس سے کوئی علیحدہ اور مصنوعی شے نہیں ہے۔ ایمان کی ان کیفیتوں کا ذکر سورۃ الحجرات میں موجود ہے جس کا ہم اپنی اِن گفتگوؤں میں بار بار ذکر کرتے آئے ہیں۔ فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے تم ہرگز ایمان نہیں لائے' لیکن یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔

یہاں مثبت انداز میں اسلام کا ذکر آیا ہے اور پھر منفی انداز میں ایمان کا ذکر ہوا ہے۔ اور اسی سورت کی آیت ۷ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحُجرٰت)

''مگر اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو نہایت محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں کے اندر خوشنما بنا دیا ہے۔''

یہ وہ کیفیت ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایمان کی گہرائی کے نتیجے میں حاصل ہو چکی تھی اور یہی احسان ہے۔

باقی یہ کہ ہمارے ہاں مروّجہ تصوف کے زیر اثر جو کیفیات آئی ہیں اس کی کیا وجہ ہے اور ''احسانِ اسلام'' جسے ہم ''سلوکِ قرآنی'' یا ''سلوکِ محمدی'' بھی کہہ سکتے ہیں' اس میں اور تصوف میں کیا فرق ہے' یہ اس بحث کا موقع نہیں ہے۔ اس موضوع پر ''مروجہ تصوف یا سلوک محمدیؐ'، یعنی احسانِ اسلام'' کے عنوان سے میرا ایک بہت اہم کتابچہ ہے۔ اس میں ذرا دقیق بحثیں بھی ہوئی ہیں۔ اس کا لفظ بلفظ مطالعہ مفید رہے گا۔ اور خاص طور پر اس کا جو انگریزی ترجمہ ہوا ہے:

"The Reality of Tasawwuf, in the Light of the Prophetic Model."

اس میں کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ دراصل ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ اور مرفہ الحال لوگوں کے اندر جب کبھی دین کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے تو وہ تصوف کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ تو اِس حقیقت کو اُن پر منکشف کرنے کے لیے یہ انگریزی کتابچہ بہت اہم ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو احسان کی تعلیم و تربیت دی' ان کا تزکیہ کیا اور اُن سے قربِ خداوندی کے مراحل طے کروائے! آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کس طور سے یہ کام کیا تھا اور ہمارے مروّجہ تصوف میں کیا شکل پیدا ہو گئی ہے اور کس طور سے ایک علیحدہ راستہ اختیار کر لیا گیا ہے' اس کا ایک خاص سبب ہے جسے بیان کرنے کا اِس وقت موقع نہیں ہے۔ یہاں جبریل علیہ السلام کے تیسرے سوال ''احسان'' کی بحث ختم ہوتی ہے۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے چوتھا سوال کیا: **اَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَةِ!** ''اب مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے!'' یعنی قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا: ((**مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ**)) ''جس سے قیامت کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا''۔ آپ ﷺ نے صاف اعتراف کیا کہ میں اس بارے میں آپؑ سے زیادہ نہیں جانتا۔ قرآن مجید کے اندر بہت واضح طور پر فرمایا گیا ہے: ﴿ **یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ﴿۴۲﴾ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا ﴿۴۴﴾** ﴾ (النّٰزعٰت) ''(اے نبیؐ!) یہ آپ سے قیامت کے

*

بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب لنگر انداز ہوگی۔ آپ کو کیا کام اس کے ذکر سے! اس کی پہنچ (اس کا علم) تو تیرے ربّ پر ختم ہے''۔ یعنی آپ ؐ کا کام ہے محض خبردار کرنا کہ یہ لازماً آئے گی' اس کے لیے تیاری کرلو۔ لیکن یہ کب آئے گی' اس سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ تو آپ ؐ نے اس کا جواب دینے سے معذرت کرلی۔

اب انہوں نے پانچواں سوال کیا: فَاَخۡبِرۡنِیۡ عَنۡ اَمَارَاتِھَا؟ ''تو مجھے اس کی علامات کے بارے میں بتا دیجیے (جس سے اندازہ ہو جائے کہ وہ زمانہ اب قریب آ گیا ہے)''۔ علاماتِ قیامت ایک مستقل موضوع ہے۔ کتب احادیث میں اشراط الساعۃ اور علامات القیامۃ کے عنوان سے باقاعدہ ابواب باندھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ تو ابتدائی اور عمومی انداز کی اور چھوٹی علامات ہیں اور دس بڑی علامتیں ہیں۔ ان میں دجال کا ظہور ہے' حضرت مہدی کا ظہور ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے' دھوئیں کا معاملہ ہے اور خسف ہے کہ زمین تین جگہ سے دھنس جائے گی' وغیرہ۔ یہ مختلف اشراط الساعۃ ہیں۔ اس سوال کے جواب میں آپ ؐ نے دو علامات کا ذکر فرمایا ہے جو ہمارے لیے بہت چشم کشا ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَنۡ تَلِدَ الۡاَمَۃُ رَبَّـتَھَا)) ''کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی''۔ اس کے معانی یہ ہیں کہ ایک دَور آئے گا کہ اولاد میں اتنی سرکشی پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے والدین کے اوپر گویا حاکم ہو جائیں گے۔ والدین ڈریں گے کہ ان سے میں نے کچھ کہہ دیا تو نمعلوم کیا جواب دیں۔ یہ کیفیت آج ہمارے ہاں پیدا ہو چکی ہے۔ اور خاص طور پر یہ بات چونکا دینے والی ہے کہ آپ ؐ لڑکیوں کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ بیٹیاں اپنی ماؤں کے ساتھ لونڈیوں کا سا سلوک کریں گی۔ حالانکہ لڑکیوں کا معاملہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ والدین کی زیادہ تابع فرمان ہوتی ہیں' ان کے سامنے سر جھکا کر رکھتی ہیں اور خاص طور پر ماؤں کا زیادہ ادب اور اُن سے زیادہ محبت رکھتی ہیں۔ لیکن آپ ؐ فرما رہے ہیں کہ بیٹیاں اپنی ماؤں کے ساتھ اپنی باندیوں کا سا سلوک کریں گی۔ اور یہ کیفیت بھی آج رونما ہو چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی دوسری علامت یہ بتائی: ((وَاَنْ تَرَی الْحُفَاۃَ الْعُرَاۃَ الْعَالَۃَ رِعَاءَ الشَّاءِ یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ)) ’’اور یہ کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پیر رہنے والے‘ ننگے بدن رہنے والے‘ انتہائی مفلس اور قلاش‘ بکریوں کے چرواہے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے‘‘۔ یہ وہ چیز ہے جسے آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ پچاس ساٹھ سال پہلے کے عالمِ عرب میں اور آج کے عالمِ عرب میں جو تضاد (contrast) واقع ہو چکا ہے وہ بہت نمایاں نظر آ رہا ہے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ حج کے موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قربانی کا جو حکم دیا ہے تو اس کی حکمت یہی تھی کہ وہاں کے رہنے والوں کو کھانے کو کچھ میسر آ جائے۔ ورنہ عالمِ عرب تو قرآن کے الفاظ میں ﴿بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ﴾ یعنی ایک غیر زرخیز وادی تھی جہاں کوئی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی: ﴿رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ......﴾ (ابرٰھیم:۳۷) ’’اے پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے......‘‘ یعنی اب تو ہی ان کی غذا کا بندوبست کر۔ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ قربانیوں کے گوشت پر جھپٹ کر پڑتے تھے‘ کھینچ کر لے جاتے تھے اور سکھا کر پھر سال بھر کھاتے تھے۔ پھر یہ کہ انہی قربانیوں کی وجہ سے بھیڑیں اور بکریاں پال کر بیچتے تھے اور یہی ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہوتا تھا۔ تو عالمِ عرب کی یہ صورتِ حال تھی۔ لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہاں دولت کی ریل پیل ہے‘ ہر قسم کی سہولت میسر ہے‘ بلکہ ان کے مشرقی ساحل پر یورپ کے شہروں کو بھی مات دینے والے شہر آباد ہو چکے ہیں۔

آگے رسول اللہ ﷺ جو فرما رہے ہیں کہ: ((یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ)) تو اس میں لفظ ’’یَتَطَاوَلُ‘‘ کو سمجھ لیجیے! یہ باب ’’تفاعل‘‘ سے ہے جس کی یہ صفت ہے کہ اس میں مبالغے کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور مقابلے کا بھی۔ یعنی یہ عرب نہ صرف اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے بلکہ ان اونچی عمارتوں کے بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔

*

9

آج یہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے کہ ایک شخص نے اگر چالیس (۴۰) منزلہ عمارت بنائی ہے تو اس کے مقابلے میں دوسرا پینتالیس (۴۵) منزلہ عمارت بنائے گا۔ آج سے تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے کہ میں ابوظبی گیا ہوا تھا اور جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا وہ ایک بہت عالی شان بلڈنگ تھی۔ اس کے قریب بھی ایک بہت عالی شان اور بلند و بالا بلڈنگ تھی' لیکن اسے گرایا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اسے کیوں گرا رہے ہیں جبکہ یہ محض چند سال پہلے کی بنی ہوئی نئی عمارت ہے؟ کہنے لگے کہ اس کے مقابلے میں اس سے اونچی ایک بلڈنگ بن گئی ہے لہٰذا اسے گرا کر اُس سے اونچی عمارت بنائی جائے گی۔ وہ عمارت گرا بھی بلڈوزر سے رہے تھے جس میں ایر کنڈیشنز' فرنیچر اور بجلی کی فٹنگ بھی ساتھ جا رہی تھی۔ اس لیے کہ لیبر مہنگی ہونے کی وجہ سے ان کے اتارنے کی لاگت ان کی قیمت سے زیادہ بن رہی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث جبریلؑ میں ایک اور سوال بھی ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام سوال کر رہے ہیں : **یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! وَمَنْ اَصْحَابُ الشَّاءِ الْحُفَاۃُ الْجِیَاعُ الْعَالَۃُ؟** ''اے اللہ کے رسولؐ! بکریاں چرانے والے' برہنہ پا' بھوکے' تنگ دست کون لوگ ہیں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **((اَلْعَرَبُ))** ''وہ عرب ہوں گے''۔ چنانچہ حدیث میں یہ پیشین گوئی بھی موجود ہے کہ وہ عرب ہوں گے۔ ویسے تو دنیا میں اور جگہوں پر بھی ترقیاں ہوئی ہیں' افلاس کے بعد دولت کی ریل پیل ہوئی ہے' اونچی اونچی اور شاندار عمارتیں بنی ہیں' لیکن عالم عرب میں گزشتہ چند دہائیوں میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **((اِنَّمَا بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ کَھَاتَیْنِ))**[۱] ''میں اور قیامت اس طرح ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں''۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ میرے بعد اب کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد اب کوئی اُمت نہیں۔ **((اَنَا آخِرُ الْمُرْسَلِیْنَ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ))** ''میں آخری رسول ہوں اور تم

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت انا والساعۃ کھاتین۔ وصحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔

آخری اُمت ہو'' ۔اب تو گویا قیامت ہی آئے گی۔اور ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آپؐ کی بعثت اور قیامت زمانے کے اعتبار سے دونوں جڑے ہوئے ہیں۔یعنی آپؐ کی بعثت کے بعد سے قیامت میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔اس موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔جامعۃ الازہر کے عالم دین پروفیسر امین محمد جمال الدین کی کتاب ''**عُمَرُ اُمَّةِ الْاِسْلَام**'' کا اردو ترجمہ ''اُمت مسلمہ کی عمر'' ہم نے بھی شائع کی ہے۔حدیث زیر مطالعہ میں رسول اکرم ﷺ نے جو دو علاماتِ قیامت بتائی ہیں ان کے ظہور پذیر ہونے سے قیامت کا معاملہ اب بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔آج ہر شخص ان علامتوں کو بچشمِ سر دیکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حدیث جبریل ؑ کو ہمارے لیے علم وحکمت کا ذریعہ بنا دے اور اِن باتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

اقول قولی ھذا استغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتOO

1

درس ۱

فرائضِ دینی کا جامع تصور

اور

جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد و مراحل

انجینئر نوید احمد☆

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ
لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ط ھُوَ اجْتَبٰىکُمْ وَمَا
جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰھِیْمَ ط ھُوَ سَمّٰىکُمُ
الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا
شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ج فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ط ھُوَ
مَوْلٰىکُمْ ج فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾﴾ (الحج)

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ
وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ﴿۹﴾ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ
تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ط ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ یَغْفِرْ لَکُمْ
ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَةً فِیْ
جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾﴾ (الصّف)

☆ اکیڈمک ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کراچی

☆ تمہیدی نکات

(۱) منتخب نصاب نمبر۲ کا درسِ اوّل سورۃ الحج کی آیات ۷۷ و ۷۸ اور سورۃ الصّف کی آیات ۹ تا ۱۲ کے مطالعہ پر مشتمل ہے۔

(۲) اِس درس کا موضوع ہے ''فرائضِ دینی کا جامع تصور اور جہاد فی سبیل اللہ کے مقاصد ومراحل''۔ یہ موضوع دراصل منتخب نصاب نمبر ایک کے مضامین کا خلاصہ اور لبِ لباب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس درس میں شامل دونوں مقاماتِ قرآنی منتخب نصاب نمبر ایک میں بھی شامل ہیں۔

(۳) فرائضِ دینی کے جامع تصور کی بار بار یاددہانی بہت ضروری ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے ایک محدود تصور کا ذہنوں پر اِس قدر غلبہ ہے کہ تنظیم اسلامی سے طویل تعلق ہونے کے باوجود ابھی تک محسوس ہوتا ہے کہ ہم اکثر دین کے روایتی تصور کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ واضح طور پر وہ بات ہماری زبان پر نہیں آتی، لیکن تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پیشِ نظر دین کا ایک محدود تصور ہی موجود ہے۔ یہ بات ذہنوں میں ٹھوک ٹھوک کر بٹھانے کی ضرورت ہے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ یہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو عقائد‘ عبادات اور رسومات کے ساتھ ساتھ سیاست‘ معیشت اور معاشرت جیسے اجتماعی گوشوں کے بارے میں بھی ایک واضح عادلانہ رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اِس کے عملی تقاضے صرف نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ اور کچھ رسومات کی ادائیگی سے پورے نہیں ہوتے‘ بلکہ اِن کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں شریعت کی پیروی کی جائے‘ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی دعوت دی جائے اور اجتماعی نظام میں دینِ اسلام کی تعلیمات کے نفاذ کے لیے مال اور جان سے جہاد کیا جائے۔ فرائضِ دینی کا یہ تصور‘ فرائض کے روایتی تصور سے مختلف بھی ہے اور بہت زیادہ جامع بھی۔

(۴) اگر فرائضِ دینی کا جامع تصور اور تدریج کے ساتھ اِس کی منازل کا صحیح شعور نہ ہو تو ہوسکتا ہے کہ ہم کسی درمیانی منزل کو آخری منزل سمجھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں۔ ورنہ ہمارے سامنے یہ بات تو رہے گی کہ ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!'' اور یہ چیز ہمیں آگے سے آگے بڑھاتی رہے گی۔ لہٰذا ہمیں اپنی منزل متعین کرنی ہے اور بلند ترین ہدف کے اعتبار سے اِس کا تعین کرنا ہے۔ باقی یہ کہ چلنا قدم بقدم ہے۔ اگر ہم نے کچھ سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر

چڑھنے کی کوشش کی تو گرنے کا شدید اندیشہ ہے۔ چنانچہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ اِن میں توازن کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ منزل بلند ہو اور دوسرے یہ کہ چلنے کے اندر جو بھی تدریج مطلوب ہے اس کو ہم نظرانداز نہ کریں۔

سورۃ الحج، آیات ۷۷، ۷۸

☆ آیت ۷۷ :

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا﴾ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو'' ...... ﴿ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ ''رکوع کرو اور سجدہ کرو'' ...... ﴿وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ﴾ ''اور اپنے ربّ کی عبادت کرو'' ...... ﴿وَافْعَلُوا الْخَیْرَ﴾ ''اور بھلائی کے کام کرو'' ...... ﴿لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾﴾ ''تاکہ تم فلاح پاؤ''.

اِس آیت میں ایسے لوگوں کو جو نبی اکرمﷺ کی لائی ہوئی تمام تعلیمات پر ایمان لے آئے، تین باتوں کی تلقین کی جارہی ہے :

(۱) رکوع کرو اور سجدہ کرو، یعنی نماز ادا کرو۔

(۲) اپنے ربّ کی عبادت کرو، یعنی دلی آمادگی کے ساتھ اُس کی کلی اطاعت کرو۔

(۳) نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے خیر کے کام کرو۔

(۱) نماز کے ساتھ شغف اِقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کا نمایاں وصف ہوتا ہے۔ سورۃ الفتح کی آخری آیت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ:

﴿تَرٰىھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا﴾

''تم اُنہیں دیکھو گے تو رکوع وسجود اور اللہ کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے''۔

اُن لوگوں کے لیے جو اِقامتِ دین کی جدوجہد میں سرگرم ہیں، نماز اللہ کی نصرت حاصل کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے۔ بے شک اللہ صبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

کٹھن مراحل میں اللہ کی مدد کے حصول کے ذرائع ہیں : نماز اور صبر۔ مشکلات کے دوران انسان کا بڑا سہارا نماز ہے۔ نماز کی غرض وغایت اللہ کی یاد اور اُس کے ساتھ تعلق کو زندہ کرنا اور مضبوط رکھنا ہے۔ ایک مؤمن کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے اللہ کی رضا کا حصول۔ اُس کی ساری دینی سرگرمیاں اِسی کی خاطر ہوتی ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ انقلابی جدوجہد میں ثابت قدم رہنے کا دارومدار اپنے نصب العین کے ساتھ پوری یکسوئی کے ساتھ وابستگی اور لگاؤ پر ہے۔ اپنے نصب العین سے وابستگی جس قدر گہری ہوگی اُسی قدر مشکلات کو برداشت کرنے اور مصائب جھیلنے کا حوصلہ زیادہ ہوگا۔ انسان نتائج کی پرواہ کیے بغیر محنت کرتا رہے گا۔ نماز' خصوصاً نوافل کا اہتمام' اِس نصب العین کے ساتھ وابستگی کا انتہائی مؤثر ذریعہ ہے۔ پھر یہ حقیقت ہمیشہ سامنے رہنی چاہیے کہ انقلابی جدوجہد کے دوران استقامت اور اِس جدوجہد میں کامیابی کا انحصار اسباب پر نہیں' اللہ کی مدد پر ہوتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا :

﴿اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ‌ۚ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ۝۱۶۰﴾

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا' اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اُس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکے گا؟ اور مؤمنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں''۔

اللہ کی مدد اللہ سے خصوصی تعلق قائم کر کے حاصل ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دین کی خدمت کے لیے تحریکی کاموں میں تو خوب وقت لگائیں لیکن اللہ سے لو لگانے کے لیے کچھ وقت مخصوص کرنے پر توجہ نہ دیں۔ یہ بھی مادہ پرستی کی ایک صورت ہے کہ بھروسہ اپنی دینی مساعی پر ہو نہ کہ اللہ کی نصرت پر۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مساعی کے ساتھ ساتھ اللہ سے بھی لو لگائی جائے اور اُس کی جناب میں گڑگڑا کر مدد کی دعا کی جائے۔ اللہ سے لو لگانے کی بہترین صورت نماز ہے۔ فرض نماز کے علاوہ نوافل کا اہتمام اِس لیے ضروری ہے کہ اِن میں انسان سکون سے طویل قیام وسجود اور اللہ سے مناجات کر سکتا ہے۔ فرض نماز میں تو امام صاحب کی اقتداء کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ نوافل میں بھی زیادہ اہمیت رات کے پچھلے پہر نمازِ تہجد کی ادائیگی کی ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت کے مطابق اِس وقت سماءِ دنیا پر اللہ تعالیٰ کی خاص تجلیات کا ظہور ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ پکارتا ہے :

((هَلْ مِنْ سَائِلٍ يُعْطٰی؟ هَلْ مِنْ دَاعٍ يُسْتَجَابُ لَهُ؟ هَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ يُغْفَرُ لَهُ؟))[1]

''ہے کوئی مانگنے والا کہ اُس کو عطا کیا جائے؟ ہے کوئی دعا کرنے والا کہ اُس کی دعا پوری کی جائے؟ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا کہ اُس کو بخش دیا جائے؟''

اقبال نے کیا خوب کہا ہے : ؎

عطار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

نماز اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کی تربیت اور تزکیہ میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ فرض نماز میں امام کی اقتداء سمع وطاعت کا خوگر بناتی ہے' باجماعت نماز میں شرکت وقت کی پابندی کا عادی بناتی ہے اور انسان کے سیرت و کردار کو برائیوں سے پاک کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ﴾ (العنکبوت : ۴۵)

''یقیناً نماز برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے''۔

نماز برائی اور بے حیائی سے اِس لیے روکتی ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کے الفاظ کے ذریعے اللہ سے عہدِ بندگی کو تازہ کیا جاتا ہے : ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

جو لوگ نماز کو سمجھ کر اور پورے شعور کے ساتھ ادا کرتے ہیں' وہ اپنے عہدِ بندگی کا پاس کرتے ہیں اور برائیوں اور بے حیائی کے کاموں سے باز آجاتے ہیں۔ گویا نماز انسان کو اپنے ربّ کی بندگی کے لیے تیار کرتی ہے' اور آیت کے اگلے حصہ میں اِسی بندگی کا ذکر ہے۔

(۲) سورۃ الحج کی آیت زیرِ درس میں دوسرا حکم ہے اپنے ربّ کی عبادت یعنی بندگی کرو۔ عبادت کے مفہوم سے ہم واقف ہیں' یعنی پورے ذوق وشوق کے ساتھ زندگی کے ہر گوشے اور ہر معاملہ میں اللہ کی اطاعت کرنا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ اپنی زندگی میں عبادتِ ربّ کا عملی نمونہ پیش کریں۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو پورے نظامِ زندگی میں اللہ کی بندگی قائم کرنے کا مشن لے کر اُٹھے ہیں۔ اب

اگر یہ اپنے وجود اور اپنے اختیار میں اللہ کی بندگی نہیں کرتے تو پھر اِن کے خلاف قرآنِ حکیم کی سخت وعید ہے کہ :

﴿یٰٓـاَیُّـھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (الصّف)

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم کیوں کہتے ہو وہ جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک بڑی ہے یہ بات بیزار کرنے کے اعتبار سے کہ تم وہ کہو جو کرتے نہیں ہو''۔

ایسے لوگوں کو سورۃ البقرۃ میں یوں جھنجھوڑا گیا :

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''کیا تم لوگوں کو نیکی کرنے کی تلقین کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم (اللہ کی) کتاب بھی پڑھتے ہو، تو کیا سوچتے نہیں ہو؟''

ع ''جن کے رُتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے'' کے مصداق اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والے جہاں ایک عظیم مشن کے حامل ہیں وہیں اُن کی ذمہ داری بھی بہت نازک ہے۔ اُن کی بے عملی لوگوں کو اِس عظیم مشن سے برگشتہ کر سکتی ہے۔ اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات میں اللہ کی بندگی کی مثال پیش کریں۔ کاروبار، ملازمت، خوشی و غمی کے مواقع، ستر و حجاب کے احکامات، صلہ رحمی، پڑوسیوں کے حقوق اور تمام معاملاتِ زندگی میں شریعت پر عمل نہ صرف اُن کی اپنی عاقبت کو سنوارنے کا ذریعہ بنے گا بلکہ اقامتِ دین کے مشن کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔ پھر اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اُن کا ایثار و قربانی بھی اللہ کے ہاں مقبول ہوگا اور اُس کے اثرات محسوس ہوں گے، کیونکہ اللہ کی سنت ہے :

﴿اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۝﴾ (المائدۃ)

''بے شک اللہ پرہیزگاروں ہی سے (ان کی قربانی) قبول فرمایا کرتا ہے''۔

(۳) آیت زیرِ درس میں تیسرا حکم دیا گیا: ﴿وَافْعَلُوا الْخَیْرَ﴾ ''اور بھلے کام کرو''۔ بھلے کام کرنے کا حکم اللہ کی عبادت کے تحت بھی آ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے مراد ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ انسانوں کی خدمت کے لیے بھلائی کے کام کرو۔ لیکن اِس آیت میں بھلائی کے کام کرنے کا علیحدہ حکم دے کر اِس

کام کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں میں انسانی ہمدردی اور اِس کے تحت لوگوں کی بھلائی کے لیے ایثار وقربانی اور بھاگ دوڑ کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ موجود ہونا چاہیے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

((مَن يُّحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ))(۲)

''جو کوئی دل کی نرمی سے محروم ہو گیا وہ (کُل کے کُل) خیر سے محروم ہو گیا''۔

دل کی نرمی کا اظہار محض زبانی جمع خرچ سے نہیں' بلکہ مشکلات میں مبتلا لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے عملی کاوشوں سے ہوتا ہے۔

انسانوں کے ساتھ بھلائی کرنے کے بھی مختلف درجات ہیں۔ پہلا درجہ ہے کہ لوگوں کی فوری مشکلات کے حل کے لیے کوشش کرنا۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا' لباس کے ضرورت مند کو کپڑا پہنا دینا' کسی بے گھر کو چھت فراہم کر دینا' کسی بیمار کا علاج کرا دینا' کسی مقروض کو قرض کے بوجھ سے آزاد کرا دینا' وغیرہ۔ نبی اکرم ﷺ ظہورِ نبوت سے قبل بھی انسانی خدمت کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے' اگرچہ آپ ﷺ کوئی صاحبِ ثروت انسان نہیں تھے۔ آپ ﷺ کے والدِ ماجد کا انتقال آپ ﷺ کی ولادت سے قبل ہو گیا تھا۔ آپ ﷺ کی پرورش پہلے والدہ' پھر دادا اور آخر میں چچا نے کی۔ لڑکپن ہی میں بکریاں چرانی پڑیں اور پھر تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ آپ ﷺ کی مالی حیثیت زیادہ نہ تھی' لیکن پھر بھی آپ ﷺ بیواؤں کی خبر گیری' یتیموں کی سرپرستی اور بھوکوں کو کھانا کھلانے کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اِسی حوالے سے کتب سیرت میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک روز نبی اکرم ﷺ گھر تشریف لائے تو بہت مغموم تھے۔ آپ ﷺ چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ حضرت خدیجہ ؓ کو فکر لاحق ہوئی اور اُنہوں نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شہر سے باہر مفلوک الحال لوگوں کا ایک قافلہ دیکھا ہے جن کے تن پر کپڑا نہیں' بڑے بھی بھوک سے نڈھال ہیں اور بچے بھی بھوک سے بلک رہے ہیں' کاش میرے پاس کچھ سرمایہ ہوتا تو میں اُن کی امداد کر سکتا۔ حضرت خدیجہؓ نے اُسی وقت مکہ کے چند سرداروں کو اپنے گھر بلایا اور اُن کو گواہ بنا کر اپنا سارا مال آپ ﷺ کو ہدیہ کر دیا۔ آپ ﷺ اِس مال کو ضرورت مندوں کی مدد کے لیے صرف فرماتے رہے۔ آپ ﷺ ''حلف الفضول'' کے نام سے ایک معاہدے میں بھی شریک ہوئے' جس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ مکہ میں جو بھی مظلوم نظر آئے گا' خواہ مکہ کا رہنے والا ہو یا کہیں اور کا' ہم سب اُس

کی مدد اور حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اُس کا حق دلوا کر رہیں گے۔

خدمتِ خلق بلا شبہ ایک بہت بڑا کارِ خیر ہے‘ لیکن اگر آخرت کی حقیقت سامنے ہو تو محض دُنیوی خدمتِ خلق کا تصور بڑا محدود (short term) اور ناقص محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہاں ہم کسی بھوکے کے پیٹ کی آگ کو تو بجھا دیں لیکن وہ غفلت کی وجہ سے پورے کا پورا جہنم کی آگ کا نوالہ بن جائے۔ نبی اکرمﷺ نزولِ وحی سے قبل دُنیوی اعتبار سے خدمتِ خلق کی سرگرمیاں انجام دیتے رہے‘ لیکن جب وحی کے ذریعے آپﷺ پر آخرت کی ابدی زندگی کے حوالے سے حقائق منکشف ہوئے تو آپﷺ کی سعی و جہد کا اولین مقصد نوعِ انسانی کو آخرت کی ناکامی سے بچانے کی کوشش کرنا بن گیا۔ مسلم شریف میں آپﷺ کا اِرشاد نقل ہوا ہے:

((مَثَلِیْ وَمَثَلُکُمْ کَمَثَلِ رَجُلٍ اَوْقَدَ نَارًا فَجَعَلَ الْجَنَادِبُ وَالْفَرَاشُ یَقَعْنَ فِیْھَا وَھُوَ یَذُبُّھُنَّ عَنْھَا‘وَاَنَا آخِذٌ بِحُجَزِکُمْ عَنِ النَّارِ وَاَنْتُمْ تَفَلَّتُوْنَ مِنْ یَدِیْ)) [۳]

’’میری اور تمہاری مثال اُس آدمی کی طرح ہے جس نے آگ جلائی تو پتنگے اور پروانے اُس میں گرنے لگے اور وہ اُن کو اُس آگ سے دور ہٹا تا ہے۔ میں بھی تمہاری کمروں سے پکڑ پکڑ کر تمہیں جہنم کی آگ سے بچا رہا ہوں لیکن تم میرے ہاتھوں سے چھوٹے جاتے (اور جہنم کی آگ میں گرتے جاتے) ہو‘‘۔

ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ جہاں ہم اپنی امکانی حد تک دکھ درد میں لوگوں کے کام آسکیں‘ وہیں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ اُن کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی ادا کریں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی معاشرے میں قائم نظام عادلانہ نہیں تو وہاں خدمتِ خلق کے کام کے مفید نتائج نظر نہیں آتے۔ استحصالی نظام لوگوں کے مسائل و مشکلات میں مسلسل اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ معاشرے میں غربت‘ افلاس اور تنگ دستی بڑھتی ہی رہتی ہے۔ مثلاً سرمایہ دارانہ سودی نظام کی وجہ سے مہنگائی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب جتنے بھی کھانے کھلائے جائیں بھوک کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں ایک طبقہ کی لوٹ کھسوٹ سے مسلسل مظلوم پیدا ہو رہے ہوں وہاں سماجی خدمت کے کاموں سے محض چند مظلوموں ہی کی دادرسی کی جا سکتی ہے۔ پانچ بے روزگاروں کے روزگار کا بندوبست کیا جاتا ہے تو دس اور پیدا

ہو جاتے ہیں۔لہٰذا دنیا میں پائیدار خدمتِ خلق یہ ہے کہ ظالمانہ نظام کے خلاف جدوجہد کر کے اُسے تلپٹ کیا جائے اور اُس کی جگہ ایک عادلانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔یہی وجہ ہے کہ دُنیوی اعتبار سے تمام رسولوں علیہم السلام کی مساعی کا مقصد تھا ایک عادلانہ نظام کا قیام۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (الحدید : ۲۵)

''بلاشبہ ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے نازل کیں اُن کے ساتھ کتابیں اور ترازو' تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں''۔

سورۃ الشوریٰ میں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ اعلان کر دیجیے:

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۵)

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔''

گویا اِس دنیا میں انسانی خدمت کا دیر پا (long term) تصور یہ ہے کہ نہ صرف بھوکے کو کھانا کھلایا جائے بلکہ بھوک پیدا کرنے کے اسباب کو ختم کیا جائے' نہ صرف مظلومین کی امداد کی جائے بلکہ مظلوم بنانے والے نظام ہی کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائے۔اگلی آیت میں اِسی کی تلقین بڑے تاکیدی انداز میں کی جارہی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ ''تاکہ تم فلاح پاؤ''۔معلوم ہوا آخرت میں دائمی فوز وفلاح کے حصول کے لیے صرف ایمان لے آنا کافی نہیں ہے بلکہ رکوع و سجود کے ذریعہ اللہ سے خصوصی تعلق قائم کرنا ہوگا۔پوری زندگی میں اللہ کی بندگی کرنا ہوگی اور اِس سے آگے بڑھ کر دوسروں کی خدمت کے لیے بھلائی کے کام کرنا ہوں گے۔

☆ **آیت ۷۸ :**

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ﴾ ''اور اللہ (کی راہ) میں جہاد کرو جیسا کہ اُس کے لیے جہاد کرنے کا حق ہے'' ...... ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ ''اُس نے تمہیں چُن لیا ہے'' ...... ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ﴾ ''اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں رکھی'' ...... ﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ﴾ ''(یہ دین) راستہ ہے تمہارے جدامجد ابراہیم ؑ کا'' ...... ﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ ''اُنہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا'' ...... ﴿مِنْ قَبْلُ

﴿وَفِیْ ھٰذَا﴾ ''اس سے پہلے اوراب بھی'' ......﴿لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ﴾ ''تا کہ (روزِ قیامت) رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر'' ...... ﴿وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ج﴾ ''اورتم گواہ بن جاؤ لوگوں پر'' ...... ﴿فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ ''پس قائم کرو نماز'' ...... ﴿وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ ''اوردوزکوٰۃ'' ...... ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ ط﴾ ''اور چمٹ جاؤ اللہ سے'' ...... ﴿ھُوَ مَوْلٰکُمْ ج﴾ ''وہ تمہارادوست ہے'' ...... ﴿فَنِعْمَ الْمَوْلٰی﴾ ''پس خوب دوست ہے'' ...... ﴿وَنِعْمَ النَّصِیْرُ○﴾ ''اورخوب مددگار ہے!''

اِس آیت میں انتہائی تاکیدی انداز میں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اِس طرح جہاد کرو جیسا کہ اُس کے لیے جہاد کرنے کا حق ہے۔ہم پر بندوں کے حقوق بھی عائد ہوتے ہیں اور اللہ کے بھی۔غور کیا جائے تو ہم پر سب سے بڑا حق اللہ کا ہے۔وہی ہمارا خالق ہے' رازق ہے' محافظ ہے اور مشکل کشا بھی۔ بلا شبہ وہ ہمارا ایسا محسنِ حقیقی ہے کہ جس کی نعمتیں ہم شمار نہیں کرسکتے۔ہم اللہ کی حمد کے لیے چند کلمات کہہ کر' کچھ عبادات ادا کرکے' کچھ صدقہ و خیرات دے کر اور ذراسی بھاگ دوڑ کرکے اللہ کی بیش بہا عنایات کا حق ادا نہیں کرسکتے۔ہمیں چاہیے کہ انفرادی زندگی کے ہر گوشہ میں اللہ کی بندگی کریں اور اجتماعی زندگی میں اُس کی تعلیمات کے نفاذ کے لیے تن من دھن سے جہاد کرکے ثابت کریں کہ : ؎

مری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اِسی لیے مسلماں' میں اِسی لیے نمازی!

یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی دل میں یہ احساس رہے کہ ع ''حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!''

﴿ھُوَ اجْتَبٰکُمْ﴾ ''اُس (اللہ) نے تمہیں چُن لیا ہے'' کے الفاظ پر غور کر کے ہمیں ایک سرور محسوس کرنا چاہیے۔اللہ نے ہمیں انسان بنایا' نبی اکرمﷺ کی تعلیمات پر ایمان لانے کی سعادت عطا کی' قرآنِ حکیم اور سنتِ رسولﷺ کی روشنی میں دینی ذمہ داریوں کا شعور دیا اور اِن ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ایک جماعت سے منسلک ہونے کی توفیق بخشی۔ **فالحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک**

احسان مندی کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کے احکامات پر عمل اور اِن کے نفاذ کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو آخری حد تک بروئے کار لائیں۔اِس حوالے سے سنتِ رسولﷺ تو یہ ہے کہ اپنی معاشی ضروریات کے لیے واجبی سی کوشش کریں تا کہ عزت سے دو وقت کی روٹی مل

جائے اور اِسی پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی اصل توانائیوں کو اللہ کے دین کی خدمت میں لگائیں' یعنی اُس کام میں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں مامور (appoint) کیا ہے۔ ہماری ترجیحات اور عمل سے ثابت ہو کہ ؎ :

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے؟

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ ''اور اللہ نے تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی''۔ یہ ہم پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں ایسا دین عطا فرمایا جو فطرت کے عین مطابق ہے۔ اِس دین میں بدعات و رسومات کا لمبا چوڑا طومار نہیں' نفس کو کچلنے والی ریاضتیں نہیں اور رہبانیت کی طرح کوئی غیر فطری پابندیاں نہیں۔ امام ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں نبی اکرمﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) ''اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں''۔ نفسانی تقاضوں کو کچلنے کے بجائے اُنہیں انسانی معاشرے کی بھلائی کے لیے صحیح رُخ پر ڈھالا (channelize کیا) گیا ہے۔ یہ دین ایک ایسی راہ کی تعلیم دیتا ہے جس میں ضبطِ نفس (self control) ہے' نفس کشی (self annihilation) نہیں۔ تمام فطری و جبلی تقاضوں کی چند حدود و قیود کے ساتھ تسکین کا بھرپور سامان ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾

(الاعراف:۳۲)

''(اے نبیؐ) پوچھئے کس نے حرام کیا اُس زیب و زینت کو اور اُس پاکیزہ رزق کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا فرمایا ہے؟''

﴿مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ''(یہ دین) راستہ ہے تمہارے جدامجد ابراہیمؑ کا''۔ دین کے تقاضوں کی ادائیگی دراصل ''ملتِ ابراہیم'' یعنی حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے' جس کی وضاحت قرآنِ حکیم میں اِس طرح آئی ہے :

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾﴾ (البقرۃ)

''اور کون ہے جو رُخ پھیرے ابراہیمؑ کے راستے سے؟ سوائے اُس کے جس نے

حماقت میں ڈال دیا اپنے آپ کو۔ اور ہم نے اُن کو چن لیا تھا دنیا میں اور بے شک وہ آخرت میں بھی یقیناً نیک لوگوں میں شامل ہوں گے۔ جب بھی اُن سے کہا اُن کے ربّ نے کہ فرماں برداری اختیار کرو‘ اُنہوں عرض کیا کہ میں نے فرماں برداری اختیار کی تمام جہانوں کے ربّ کی‘‘۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ ایک ایسی مسلسل جدوجہد کی داستان ہے جس کا مقصد اللہ کی اطاعت اور اللہ کی خوشنودی کا حصول تھا۔ ہمیں بھی اِسی اُسوۂ ابراہیمؑ کی پیروی کرنا چاہیے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود نبی اکرم ﷺ کو اِسی کا حکم دیا :

﴿ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا﴾ (النحل : ۱۲۳)

’’پھر ہم نے آپؐ کی طرف وحی بھیجی کہ پیروی اختیار کیجئے ابراہیمؑ کے راستہ کی جو بالکل یکسو تھے‘‘۔

﴿ہُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ ’’اُنہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا‘‘۔ آیت کے اِس حصہ میں اشارہ ہے اُس دعا کی طرف جو بیت اللہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے اللہ کی بارگاہ میں کی تھی کہ :

﴿رَبَّنَا وَ اجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ﴾ (البقرۃ: ۱۲۸)

’’اے ہمارے ربّ! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولادوں میں سے اپنی فرماں بردار اُمت پیدا فرما‘‘۔

ہمیں اللہ کا فرمانبردار بن کر اُس نام کی لاج رکھنی چاہیے جس سے ہمارے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہمیں موسوم کیا۔ مزید یہ کہ اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو ہمیشہ اپنا تعارف بطور مسلم ہی کرانا چاہیے اور کسی مسلکی یا فرقہ وارانہ شناخت کو اپنی پہچان نہیں بنانا چاہیے۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَ مَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

’’اور اِس سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ مَیں مسلمانوں میں سے ہوں!‘‘

﴿لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ﴾ ’’تاکہ رسولؐ

گواہ ہو جائیں تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر‘‘۔ آیت کے اِس حصہ میں اُس کٹھن ذمہ داری کا بیان ہے جو اُمتِ مسلمہ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری ہے ’’شہادت علی الناس‘‘۔ ’’شہادت علی الناس‘‘ کا مفہوم ہے قول و عمل کے ذریعہ دینی تعلیمات کی گواہی کا حق ادا کر کے نوعِ انسانی پر حجت تمام کرنا تا کہ وہ روزِ قیامت اللہ کے سامنے اپنی بے عملی کا کوئی جواز نہ پیش کر سکیں۔ اِس اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہے کہ دین کو قائم و نافذ کیا جائے تا کہ نوعِ انسانی پر اس کا قابلِ عمل ہونا ثابت ہو اور باطل نظام کا جبر کسی کے لیے اسلام قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

’’شہادت علی الناس‘‘ کی ذمہ داری ہمیں اُسی طرح سے ادا کرنی ہے جیسے اللہ کے رسول ﷺ نے ادا فرمائی۔ آپ ﷺ نے اِس کے لیے اپنے ذاتی کردار کی اعلیٰ مثال پیش فرمائی، دعوت و تبلیغ کا حق ادا کیا اور ایک کٹھن جدوجہد کے ذریعے بالفعل دینِ حق کو غالب کر کے نوعِ انسانی پر حجت قائم فرما دی۔ نبوت کے خاتمہ کے بعد اب ’’شہادت علی الناس‘‘ کی ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ہے۔ روزِ قیامت اللہ کے رسول ﷺ اللہ کی عدالت میں گواہی دیں گے کہ اے اللہ! میں نے اپنی اُمت کے سامنے دین پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا‘ اب یہ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں :

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ (النساء)

’’پس اُس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور اس اِمت پر (اے نبی ﷺ!) ہم آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے!‘‘

اِسی لیے آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر بڑے اہتمام سے صحابہؓ سے پیغام پہنچا دینے کا اقرار لیا اور اِس پر اللہ کو گواہ بنایا۔

نبی کریم ﷺ تو ہم پر اتمامِ حجت فرما کر سرخرو ہو گئے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے قول و عمل اور غلبۂ دین کی اجتماعی جدوجہد کے ذریعے ’’شہادت علی الناس‘‘ کا فریضہ ادا کریں۔ اِسی کٹھن ذمہ داری کے احساس کا بارِ گراں تھا جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ اور مکہ سے نکل کر دُنیا کے بڑے حصے میں پھیل گئے اور دینِ حق کے پیغام کو مختصر سے عرصے میں دور دور تک پہنچا دیا۔ اگر ہم نے بھی صحابہ کرامؓ کی طرح مال و جان سے دین کی تعلیمات لوگوں

تک پہنچا ئیں تو ہم بھی روزِ قیامت سرخرو ہو جائیں گے۔ بصورتِ دیگر ہم ایسے مجرم ثابت ہوں گے کہ نہ صرف اپنی کوتاہی بلکہ دوسروں کی گمراہی کا وبال بھی ہمارے سر آئے گا۔ روزِ قیامت لوگ الزام لگائیں گے کہ یہ دین کے وہ نام لیوا ہیں جو اپنے سیرت و کردار کی وجہ سے دین کی قبولیت کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔

آخر میں حکم دیا گیا: ﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ''۔ یعنی اب اٹھو اور عمل کا آغاز کرو۔ عمل کا آغاز ہوگا ارکانِ اسلام کی ادائیگی سے‘ جو دینی فرائض کی عمارت میں ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔

اِس کے بعد فرمایا: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ '' اور چمٹ جاؤ اللہ سے''۔ گویا دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی اللہ سے مضبوط تعلق پیدا کیے بغیر ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کے لیے نوافل کا اہتمام کرنا ہوگا‘ تاکہ اُس سے لو لگا کر مدد اور دستگیری کی التجا کی جاسکے۔ اِسی طرح اللہ سے چمٹنے یعنی اُس کی قربت کے حصول کے لیے اللہ کی رسّی یعنی قرآنِ حکیم سے چمٹنا ہوگا۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آلِ عمران : ۱۰۳)

''اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور گروہ گروہ نہ ہو جاؤ''۔

جامع ترمذی میں موجود ایک حدیث کی روشنی میں اللہ کی رسّی سے مراد قرآنِ حکیم ہے:

((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ ' وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ ' وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ))[٤]

''قرآن ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے‘ اور حکمت بھرا ذکر ہے‘ اور وہی صراطِ مستقیم ہے''۔

گویا قرآنِ حکیم ہی جہاد فی سبیل اللہ اور شہادت علی الناس کے فرائض کی ادائیگی کے لیے مرکز و محور ہے۔

اِس آیت کا اختتام بڑے حوصلہ افزا الفاظ پر ہوا‘ یعنی: ﴿هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ ''وہ تمہارا ساتھی ہے‘ پس خوب ساتھی اور خوب مددگار ہے!'' دین کے تقاضوں کی ادائیگی بلاشبہ ایک مشکل کام ہے‘ لیکن اِس راہ میں اہلِ ایمان کا پشت پناہ‘ ساتھی اور مددگار اللہ ہے :

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

اللہ کی مدد ایسے لوگوں کو ضرور مل کر رہتی ہے جو اللہ کے دین کی مدد کے لیے کمر کس لیں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ :

﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ وَيُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ﴿۷﴾﴾ (محمد)

''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا''۔

﴿وَلَيَنۡصُرَنَّ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيۡزٌ﴿۴۰﴾﴾ (الحج)

''اور جو اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ ضرور اُس کی مدد فرماتا ہے' بے شک اللہ یقیناً بڑی قوت والا زبردست ہے''۔

جسے اللہ کی مدد میسر آ جائے اسے تو سب سے بڑا سہارا مل گیا۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۰ کے حوالے سے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ :

﴿اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَـكُمۡ ۚ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ ‌ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ﴿۱۶۰﴾﴾

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اُس کے بعد کون تمہاری مدد کر سکے گا؟ اور مؤمنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں''۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل......

(۲) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب فضل الرفق۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب شفقتہٖ علیٰ اُمتہ ......

(٤) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

اسلام میں معلّم کا کردار

عتیق الرحمٰن صدیقی

علم و آ گہی کی اہمیت و افادیت سے ناشناسا اور محروم معاشرہ بے شمار رذائل و مفاسد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ مختلف النوع مصیبتوں اور آفتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے‘ بگاڑ و فساد انتہاؤں کو چھونے لگتا ہے‘ انتشار و خلفشار اور عداوت و منافرت کی سمیّت اور زہرنا کی سے فضائیں مسموم ہو جاتی ہیں‘ مؤدت و مؤانست کی بو باس باقی نہیں رہتی‘ حقوق و فرائض کے مابین ربط و ارتباط ڈھیلا پڑ جاتا ہے‘ معاشرہ کے افراد تعصّبات کے تنگ دوائر میں محبوس ہونے کے باوجود اپنی جاہلانہ روش پر قائم رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ کسی ہادی‘ معلّم اور مصلح کی دعوت بھی انہیں چونکا دینے سے قاصر رہتی ہے اور وہ اپنی جہالت پر دل گرفتہ نہیں ہوتے بلکہ مختلف توجیہوں سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجیے قرآنی آیات کی روشنی میں مکہ کے مشرکین‘ مدینہ کے یہود و منافقین اور دوسرے اعدائے دین کا طرزِ عمل:

﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِى الۡاَرۡضِۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ۝۱۱
اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَلٰـكِنۡ لَّا يَشۡعُرُوۡنَ ۝۱۲﴾ (البقرۃ)

’’جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔‘‘

﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ‌ؕ
اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰـكِنۡ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۳﴾ (البقرۃ)

’’اور جب ان سے کہا گیا کہ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لے آؤ تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ کیا ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان

لائیں؟ خبردار! حقیقت میں تو یہ خود بے وقوف ہیں مگر یہ جانتے نہیں ہیں (یعنی علم سے تہی ہیں)۔"

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا ہُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیۡرٍ ۙ﴿۸﴾ ثَانِیَ عِطۡفِہٖ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ﴾ (الحج:۸،۹)

"بعض لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے بھٹکا دیں۔"

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَہۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ ٭ۖ وَّیَتَّخِذَہَا ہُزُوًا ؕ﴾ (لقمٰن:٦)

"اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلامِ دلفریب خرید کر لاتا ہے تاکہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے علم کے بغیر بھٹکا دے اور اس راستے کی دعوت کو مذاق میں اڑا دے۔"

سورۃ التوبۃ میں دیہاتی اور صحرائی عربوں کے بارے میں کہا گیا:

﴿اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ ؕ﴾ (التوبة:٩٧)

"یہ بدوی عرب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملہ میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کی حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔"

علم دراصل روشنی ہے اور جہالت اندھیرا ہے۔ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بات بنتی نہیں بلکہ بگڑ جاتی ہے جب تک کہ کوئی بندۂ حق اندیش "العلم" کی قندیل روشن نہ کرے اور نظامِ حق کو بگاڑنے کی کوششوں کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ اوپر کی ان آیتوں میں جہالت کی مختلف جہتوں کو مبرہن کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـُٔہُمُ الطَّاغُوۡتُ یُخۡرِجُوۡنَہُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ﴾ (البقرة:٢٥٧)

"جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے، وہ ان کو تاریکیوں سے

نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں' وہ انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لاتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب کو''نورِ مبین'' کے نام سے موسوم کیا۔اس نور سے منور ہوئے بغیر یہ ممکن نہیں کہ اللہ کا نائب یعنی خلیفۃ اللہ اپنے منصب کے تقاضے پورے کر سکے۔اس لیے ہر مسلمان مرد اور عورت پر یہ لازم قرار دیا گیا کہ وہ علم حاصل کرے۔طلب علم کے لیے سفر کو عبادت سے' اس راہ میں موت کو شہادت سے اور علمی تحقیق میں بحث و کلام کو جہاد سے تعبیر کیا گیا۔ ہر لحظہ تدبر' تفکر اور سوجھ بوجھ سے کام لینے پر زور دیا گیا۔کہا گیا کہ مہد سے لحد تک علم کی طلب اور جستجو میں رہو۔

اوّلین انسان اور سلسلۂ نبوت کے بانی حضرت آدم علیہ السلام تھے۔آپؑ کی خلافت کا ذکر علم کے ساتھ ہوا۔معلم حقیقی نے انہیں تمام نام سکھا دیے: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾۔حضرت آدمؑ کو معلّمی کے منصبِ جلیلہ پر متمکن کر دیا گیا اور کہا گیا کہ ہدایت کا چلن عام کریں۔اور پھر اس سلسلے کا اختتام حضور نبی کریم ﷺ پر جس اوّلین وحی سے ہوا وہ بھی علم اور قلم سے متعلق تھی:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝٥﴾ (العلق)

''پڑھو (اے نبی!) اپنے ربّ کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا ربّ بڑا کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا' اور انسان کو وہ علم دیا جو وہ جانتا تک نہ تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام اور بالخصوص نبی محترم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے انسانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام فرمایا اور تمام نبیوں اور رسولوں کو ایک نہایت احسن معیار کا کامل اور بہترین نمونہ بنایا۔حقیقت میں ہر نبی انسانیت کا معلم تھا' انسانیت کی صلاح و فلاح اور نشو و ارتقاء کا ہر پہلو اس کے پیشِ نظر تھا۔حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا))[1] یعنی ''میں معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔مکارمِ اخلاق کی تکمیل اور حسنِ اخلاق کا اتمام اپنی بعثت کا مقصد بتایا: ((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ))[2] اور: ((بُعِثْتُ

---

(۱) سنن ابن ماجه' المقدمة' باب فضل العلماء والحث على طلب العلم۔

(۲) مجمع الزوائد للهيثمي ۱۸/۹۔ ومختصر المقاصد للزرقاني: ۱۸٤۔

لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ))(۱) اور: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ صَالِحَ الْاَخْلَاقِ))(۲) یعنی مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں زندگی کے تمام تر شعبوں کو جادۂ مستقیم پر گامزن کر دوں۔ آپ ﷺ نے ایک طرف تو معلم کو مدارج اخلاق کا مخزن بتایا تاکہ وہ ضوفشاں ہو کر روشنی بکھیرے اور دوسری طرف اہل علم کو انبیاء کرامؑ کے وارث قرار دیا: ((اِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ، اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَارًا وَلَا دِرْهَمًا، اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ))(۳) ''بے شک اہل علم انبیاء کے وارث ہیں' اور انبیاء دینار و درہم وراثت میں نہیں چھوڑتے' بلکہ ان کی وراثت علم ہے''۔ وہ اپنے پیروکاروں کو اسی کا امین بناتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگوں سے کسی اجر کے طالب نہیں ہوتے' ان کا مشن طلب اور تحریص سے بالاتر ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام جو دراصل اللہ کی طرف سے معلّم بنا کر بھیجے گئے ہوتے ہیں' ان کا رول ذیل کی آیات میں ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کعبہ کی دیواریں کھڑی کرتے ہوئے بارگاہ ربّ العزت میں دست بدعا ہوتے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾﴾ (البقرۃ)

''اے ہمارے ربّ! ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو اُن کو تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً تو بڑا مقتدر (اور) حکیم ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے باپ بیٹے کی یہ دعا قبول فرمائی اور سورۃ البقرۃ ہی میں ارشاد ہوا:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾

''جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے' تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

---

(۱) موطأ امام مالك، كتاب الجامع، باب انه قد بلغه ان رسول الله ﷺ قال بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔

(۲) مسند احمد: ۸۵۹۵۔ ومجمع الزوائد للهيثمى ۱۸/۹۔

(۳) سنن الترمذی، کتاب العلم عن رسول الله ﷺ، باب ما جاء فى فضل الفقه على العبادة۔

سورۂ آل عمران میں بعثتِ محمدیؐ کو اہل ایمان پر اپنا احسانِ عظیم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٦٤﴾﴾ (آل عمران)

''درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے' ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔''

اس مضمون کو سورۃ الجمعہ میں بھی بیان فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢﴾﴾

''وہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے' حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔''

ان تمام تر آیات میں رسول اللہ ﷺ کی منصبی ذمہ داریاں گنوائی گئی ہیں' یعنی تلاوتِ آیات' تعلیم کتاب' تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس ——— یہ چار اہم کردار بھی ہیں اور اپنا مضمون پیش کرنے کے لیے چار اہم اقدامات بھی۔ یعنی یہاں پر قاری' معلم' مربی ومزکی اور صاحبِ حکمت کے طور پر حضور نبی کریم ﷺ کو پیش کیا گیا ہے۔

(ا) یتلو' تلاوت سے مشتق ہے اور تلاوت کے اصل معنی اتباع اور پیروی کے ہوتے ہیں۔ یعنی معلم کتاب کے متن کو صحت تلفظ کے ساتھ' ٹھہراؤ کے ساتھ اور مناسب رفتار سے پڑھ کر سنائے اور سامعین یعنی تلامذہ قراءتِ معلم کی ہو بہو پیروی کریں۔

(ب) متن کی توضیح وتشریح کی جائے' جو معانی مضمر ہوں انہیں کھولا جائے' سوالات کے جوابات دیے جائیں' مخاطبین کو پوری طرح مطمئن کیا جائے اور ہر پہلو کو واضح کیا جائے۔

(ج) حکمت کی تعلیم کا طریقہ عقلوں کی تربیت اور کردار کی تعمیر ہے' کسی کو حکمت منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بکثرت مشق کرائی جائے' فہم کے لیے روشنی مہیا کی

جائے اور غور و فکر اور تعقل و تدبر کی عادت ڈالی جائے۔ حضور نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجالس میں ایسے سوالات کرتے جن سے وہ سوچنے پر مجبور ہوں اور ان میں قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ آپ ؐ نے کئی چیزوں کی حکمت تمثیلات کی مدد سے سمجھائی۔

(د) تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کا اصل مقصود تزکیۂ نفوس ہے، یعنی افرادِ معاشرہ کو فکری اور عملی طور پر سنوارنا اور نکھارنا۔ انبیاء کی جدوجہد کا اصل ہدف ہر انسان اور ہر معاشرہ کا تزکیہ ہے۔ تزکیہ کا مفہوم کسی چیز کو صاف ستھرا بنانا، اس کو نشوونما دینا اور اس کو پروان چڑھانا ہے۔ نفس کے اندر جو غلط افکار و نظریات جڑ پکڑ گئے ہوں ان کی جڑیں اکھاڑنا، عادات و اخلاق کی ناہمواریوں اور کمزوریوں کو دور کرنا اور نیکی کو بدی پر غالب کر کے ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کرنا ہے۔

قرآن حکیم نے دوسرے مقام پر رسول اللہ ﷺ کو شاہد، مبشر، نذیر، داعی الی اللہ اور سراج منیر ایسے ناموں سے موسوم کیا، فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ﴿۴۶﴾﴾ (الاحزاب) ''اے نبی! ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر''۔ آپ ﷺ جن و انس کے لیے رحمت کا پیام لے کر تشریف لائے تھے، یہ دعوت بنی نوع انسان کے لیے رحمت تھی۔ آپ ؐ کی اس دعوت سے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل گیا، ظلم و طغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں، خدا اور اس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ قرآن نے کہا:

﴿الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴿۱﴾﴾ (ابرٰهیم)

''الف، لام، را (اے محمد ﷺ!) یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ ان کے رب کی توفیق سے اس خدا کے راستے پر جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔''

ان آیات میں جو کچھ بیان ہوا ہے یہ اسلامی نظامِ تعلیم کے ترکیبی عناصر بھی ہیں اور معلم کے کردار کی مختلف جہتیں بھی۔ تبشیر و تنذیر اور شہادت ایک داعی کے مختلف رویے بھی ہیں جو وہ مختلف مراحل میں موقع و محل کی مناسبت سے اختیار کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے عہد مسعود میں

اور صحابہؓ نے خلافت راشدہ کے دور میں جو نظامِ تعلیم رائج کیا اس کے خال وخد میں علم وعمل کی وحدت و یکجائی بھی ہے، معلم ومتعلّم کے مابین گہری رفاقت بھی ہے، مفت تعلیم بھی ہے، یکساں نصاب بھی ہے، حریت فکر بھی ہے، بے خوف وخطر رائے کی آزادی بھی ہے اور تعلیم وتربیت کے اس نظام میں ہر لحظہ اخلاق حسنہ کی روح بھی کارفرما ہے اور تعلیم پر کسی خاص گروہ کا اجارہ بھی نہیں اور معلم کے علومرتبت کا پورا لحاظ بھی موجود ہے۔ آپ ﷺ کی معلّمانہ حکمت عملی میں تنظیم و تنسیق بھی ہے، تنوع بھی ہے، مکالماتی انداز بھی ہے اور تقریری وتحریری بھی، انفرادی طور پر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اور اجتماعی طور پر بھی خیر و بھلائی کی جانب راغب کرنے اور منکرات سے روکنے کا عمل بھی ہے۔ نامساعد حالات میں صبر ومصابرت کی کیفیت موجود رہتی ہے، یاس و نومیدی کا کوئی گزر نہیں، بلکہ ہر ساعت رجائیت کا چلن ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس تمام تر جدوجہد میں استاد کا مقام سب سے زیادہ اہم ہے، اس کی حیثیت مرکز ومحور کی سی ہے، وہ صرف پیغام رساں نہیں، اس کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ تلامذہ کو معلومات فراہم کرے، بلکہ وہ تعلیم کے اصل مقصد کو ہدف بنا کر آگے بڑھنے پر مامور ہے۔ تعلیم ایک ایسا عمل ہے کہ جس کے ذریعے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے اور تعلیم اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس وشعور کو نکھارنے کا مفید وسیلہ ہوتی ہے۔ تعلیم زندگی کے مقاصد وفرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی، مذہبی اور ذہنی ورثے کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرتی رہتی ہے۔ اور اسلامی تعلیم وہ ہے جو انسان کو ہدایت الٰہی کی روشنی میں ذہنی، جسمانی اور طبعی قوتوں کے ذریعے مادی کائنات میں اس طرح تصرف کے قابل بناتی ہے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا فروغ، رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ بنے اور بالآخر اُخروی فوز وفلاح حاصل ہو جائے۔ ۱۹۷۷ء میں مکہ مکرمہ میں اسلامی تعلیم پر ہونے والی عالمی کانفرنس میں تعلیم کا جو مقصد طے کیا گیا تھا اگر اس پر بھی نظر دوڑالی جائے تو بات زیادہ مبرہن ہو جائے گی:

> ''تعلیم کا مقصد انسانی روح، ذہانت، استدلال، محسوسات اور حسیاتی قوتوں کے ذریعے انسان کی مکمل اور متوازن نشوونما ہے۔ چنانچہ تعلیم کو انسانی شخصیت کے روحانی، ذہنی، تصوراتی، طبعی، سائنسی اور لسانی پہلوؤں کی انفرادی اور اجتماعی سطح پر نشوونما کے لیے فکری غذا فراہم کرنی چاہیے تاکہ وہ نیکی کے رخ پر ڈھل سکیں اور اس طرح انسان کی

شخصیت کی تکمیل ہو سکے۔‘‘

فکری اور ثقافتی ورثہ کے انتقال کے لیے رسمی طریقہ ہی زیادہ موزوں‘ منضبط‘ مربوط اور مؤثر ہوتا ہے اور اس کا مرکز تعلیمی درسگاہ اور ادارہ ہی ہے جس کا والی و وارث اور مرکزی کردار صرف استاد ہے۔ استاد ہی اپنے انقلابی عمل سے اسے تب و تاب عطا کر سکتا ہے۔ وہ فراہمیٔ معلومات تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتا‘ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ ایسے طلبہ تیار کرتا ہے جو دنیا بھر کی قیادت کریں‘ وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے عملی جدوجہد کرتا ہے اور تعلیمی ادارے کے پورے ماحول کو اسلامی رُخ پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ طلبہ کی علمی قیادت اس طرح کرتا ہے کہ وہ تمام علوم اور نظریات کی اسلام کے نقطۂ نظر سے چھان پھٹک کر سکیں۔ اس کی تدریس اثر انگیز ہوتی ہے اور وہ تمام ضروری نکات کی تصریح و توضیح کرتا ہے‘ سوال و جواب کا انداز اپناتا ہے‘ اس کا شخصی رویہ مؤثر ہوتا ہے‘ وہ سیرت و کردار‘ علمی فضیلت اور ابلاغ میں ایک روشن مثال ہوتا ہے۔ وہ مطالعہ و تحقیق کا ذوق رکھتا ہے اور اپنے طلبہ میں اس ذوق کو ابھارتا ہے۔ وہ مطالعہ کا شوقین ہوتا ہے اور شاگردوں کی تشویق میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ وہ ممتحن کی حیثیت سے ایک معروضی معیار پیش نظر رکھتا ہے اور دیانت و امانت کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔

معروف دانشور خرم جاہ مراد کے خیال میں استاد کے لیے چار میدان ہیں‘ اس کو اپنا مقام پہچاننا ہے اور اپنا کام کرنا ہے۔ ایک اس کی اپنی ذات ہے‘ ایک اس کا اپنا علم ہے‘ ایک اس کا شاگرد ہے اور ایک اس کی تعلیم کا عمل ہے—— اس کا پہلا کام خود اپنی صورت گری ہے‘ اپنی ذات کی تشکیل ہے‘ اپنی خودی کی تعمیر ہے‘ اپنی صلاحیتوں کا نشو و ارتقاء ہے۔ یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے آپ کو ایک اہم مقصد کے لیے وقف نہ کرے۔ مقصد سے لگن بھی ہو اور عشق بھی۔ اور یہ مقصد دین حق کو ادیانِ باطلہ پر غالب کرنا اور ایک صاف ستھری سوسائٹی کا قیام ہے۔ دوسرا اعلیٰ علمی معیار کا حصول اور تخلیقی صلاحیتوں کی نمو‘ نقد و انتقاد اور جدت فکر کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونا ہے‘ اسلامی نظامِ تعلیم کو بروئے کار لانے کے لیے نصابی کتب کی تیاری بھی ہے۔ شاگرد سے ایسا تعلق جو اس کی شخصیت و کردار پر اسلامی نقوش مرتسم کر سکے‘ ایسا نہ ہو کہ علم صرف تلاشِ معاش اور تن آسانی کا ذریعہ بن جائے۔ معلم کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی تمام تر قوتیں اور صلاحیتیں اسلام کے احیاء کے لیے وقف کر دے اور اپنے ادارے میں اس

مقصد عظیم کے لیے ایک فعال ستون بن کر کھڑا ہو جائے۔

عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی تعمیر اور تشکیل نو اسلام کے مطابق کرے۔ ظاہر ہے اس جہد وسعی کا اہم ترین محاذ نظامِ تعلیم کا میدان ہے اور اس میدان میں استاد کا رول ہی سب سے اہم ہے۔ وہ معاشی محرومیوں اور معاشرتی الجھنوں کے باعث ذہنی وفکری افلاس میں مبتلا ضرور ہے مگر اپنے من میں ڈوب کر اپنا سراغ پانے کی کوشش کرے، اللہ سے سنبھلنے کی توفیق طلب کرے اور اپنے جلو میں برق وشرر کی خلش لے کر تعلیمی ماحول کو صبح نو سے ہمکنار کرنے میں جت جائے تو یقیناً فوز وفلاح اس کا مقدر رہو گی۔ حضرت اقبال نے کہا تھا:

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نہ گردد خاکِ تو مثل مزار

''زندگی کا راز جستجو میں مخفی ہے۔ اس کی حقیقت اور بنیاد آرزو میں پوشیدہ ہے۔ آرزو کو اپنے دل میں زندہ رکھ تا کہ جس مٹی سے تو بنا ہے وہ مزار بن کر نہ رہ جائے۔''

اخذ واستفادہ

(۱) حضور اکرم ﷺ کے قائم کردہ نظام تعلیم وتربیت کی روح، از محمد صلاح الدین
(۲) احیائے اسلام اور معلم، از خرم جاہ مراد
(۳) تعلیم اور سیرت سازی، محمد اسلم سلیمی
(۴) معلم معمار قلب ونظر، ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی
(۵) تفہیم القرآن، جلد اوّل، دوم، پنجم، از سید مودودیؒ
(۶) حیاتِ رسولِ اُمی ﷺ، از خالد مسعود

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

صہیب احمد شکیل احمد خان ☆

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے، ایک اللہ کا کلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی بعثت، جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ و اشاعت اور تعلیم و تفہیم کا واسطہ بنایا بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مأمور کیا، تاکہ وہ کلام اللہ کا اصل و صحیح منشا پورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ایسے حالات میں ہوا جب کہ پوری انسانیت کی اخلاقی و سماجی حالت انتہائی پست ہو چکی تھی۔ کہیں دورِ وحشت چل رہا تھا تو کہیں شرک و بُت پرستی کا بازار گرم تھا۔ مصر اور ہندوستان، بابل و نینوا، یونان اور چین میں تہذیب و تمدن اپنی شمعیں گل کر چکے تھے۔ عرب کے کچھ شقی القلب لوگ اپنی معصوم بچیوں کو جھوٹی شرم و عار سے بچنے کے لیے ایک خود ساختہ تخیل اور ایک ظالمانہ روایت کی بنا پر اپنے ہاتھوں زمین میں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اخلاقی جرائم، شراب نوشی اور قمار بازی کی بھرمار تھی۔ عیش پرستی، ہوس رانی، حقوق کی پامالی، ظلم و استبداد، معاشی استحصال، ظالمانہ نظاموں اور غیر منصفانہ قوانین کا بول بالا تھا۔ شراب کے نشے میں ڈوبے معاشرے میں ماں، بہن، بیٹی کے لیے کوئی تحفظ نہ تھا۔ انسان تو اُن کے ظالمانہ رسم و رواج کے نشانہ تھے ہی، جانوروں کے ساتھ بھی ان کی سنگدلی حد سے بڑھ چکی تھی۔ جاہلیت میں یہ رواج عام تھا کہ کسی زندہ جانور کو لٹکا کر اس کو تیراندازی کا نشانہ بناتے۔ اسی طرح زندہ اونٹ کا کوہان کاٹ لیتے یا چلتے پھرتے دنبے کی چکی کاٹ لیتے اور اس طرح وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے۔

یہ تھے وہ بدترین حالات جن میں محسنِ انسانیت محمد عربی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین تبدیلی کا پیغام لے کر میدانِ کارزار میں تن تنہا اترتے ہیں۔ ایسے مایوس کن حالات میں اگر کوئی دوسرا

☆ ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (انڈیا)

ہوتا تو شاید زندگی سے دُور بھاگ کھڑا ہوتا۔اس عالم رنگ و بو میں ایسے نیک اور حساس لوگ بکثرت پائے گئے ہیں جنہوں نے بدی سے نفرت کی مگر وہ بدی کا مقابلہ کرنے پر تیار نہ ہو سکے اور اپنی جان کی سلامتی کے لیے تمدن سے کنارہ کش ہو کر غاروں اور کھوہوں میں پناہ گزیں ہوئے اور جوگی وراہب بن گئے' مگر حضور اکرم ﷺ نے انسانیت کی نیّا کو طوفانی موجوں میں ہچکولے کھاتے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی فکر نہیں کی' بلکہ بدی کے ہلاکت انگیز گردابوں سے لڑ کر ساری انسانیت کے لیے نجات کا راستہ ہموار کیا' تمدن کی کشتی کی پتوار سنبھالی اور پھر اسے منزل مقصود کی طرف رواں کر دیا۔

مشیت الٰہی نے جہاں ایک طرف انسانیت کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے کے لیے حضور نبی کریم ﷺ کی بہترین ہستی کا انتخاب فرمایا وہیں دوسری طرف وقت کے بدترین حالات کے باوجود آپ ﷺ کے لیے بہترین زمانہ' بہترین مقامِ دعوت اور بحیثیت اوّلین مخاطب کے بہترین قوم کا بھی انتخاب کیا۔رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہ تو صحافت کا وجود تھا' نہ ہی لاسلکی کی طاقت انسانوں کے قابو میں آئی تھی اور نہ ہی آواز کو بلند کرنے اور پھیلانے والے آلات ایجاد ہوئے تھے۔ایسے وقت میں وادیٔ مکہ کے بسنے والوں کو ایک جگہ متعین وقت میں جمع کرنے کا کیا ذریعہ ہو سکتا تھا؟ کس طرح ان جہلاء کے دل ودماغ پر اتنا اثر ڈالا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی دلچسپیوں سے ہاتھ کھینچ لیتے اور بھاگتے ہوئے سب کے سب آپؐ کی طرف چلے آتے؟ مگر چونکہ آپؐ کا تعلق بھی عرب ہی سے تھا اس لیے آپؐ ان کی عادتوں اور رسم ورواج سے اچھی طرح واقف تھے۔ساتھ ہی ربِّ کائنات نے آپؐ کو حد درجہ کی عقل وخرد عطا کی تھی۔آپؐ بے حد نرم مزاج اور شیریں بیاں تھے۔آپ کی گفتگو سادہ' ملائم اور رسیلی ہوتی تھی۔انہی اوصاف اور کریمانہ صفت کے طفیل عرب آپ پر گرویدہ ہو گئے اور بہت ہی کم مدت میں دائرۂ اسلام اس قدر وسیع ہو گیا جس کی توقع انسانی فکر سے بالاتر ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ قرآن حکیم کے بلاکم وکاست بیان ہی کا دوسرا نام ہے۔ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ قرآنی تعلیمات کی آئینہ دار ہے۔یہ وہ جامع اور کامل اسوۂ حسنہ اور بہترین نمونۂ عمل ہے جو وحدتِ انسانی کے تصور کی بنیاد پر بلا قید مکان وزمان اور بلا لحاظِ قوم وملک بنی نوع انساں کی ہدایت کا ایک لازوال سرچشمہ ہے اور ہر فردِ بشر کے لیے ہدایت کا نور ہے۔سیرتِ نبوی ﷺ کے جس پہلو پر بھی روشنی ڈالیں وہی نمایاں اور چمک دار نظر آتا ہے۔آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا ہر لمحہ اور صلح وجنگ کے حالات اس کے شاہد ہیں کہ

آپ ﷺ کی تمام تر سعی و جہد کا ہدف اخلاقِ صالحہ کی تکمیل اور بنی نوعِ انسان کو زیورِ اخلاق سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ جبر و استبداد پر مبنی نظام کا قلع قمع کر کے اسلام کے عادلانہ و منصفانہ نظام کا قیام تھا۔

رسول اللہ ﷺ عام دُنیوی معاملات اور لین دین کے معاملہ میں خود کو کبھی بھی دوسروں سے برتر خیال نہ کرتے تھے۔ ایک یہودی کا آپؐ پر کچھ قرضہ تھا' وہ طلب کرنے آیا اور نہایت خشونت و بداخلاقی سے پیش آیا اور غصے سے کہا کہ تم بنی ہاشم جب بھی کسی سے کچھ لیتے ہو تو دینے کے لیے نہیں آتے۔ یہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہے جہاں آپؐ ایک فرماں روا کی حیثیت رکھتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کے ان نازیبا کلمات پر بہت غصہ آیا جس پر آپؐ نے تنبیہہ فرمائی اور قرض دار کو قرض سے زائد رقم ادا کر دی۔ اس حسن اخلاق کا وہ اس قدر دیوانہ ہو گیا کہ فوراً دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ قریش پر آپؐ کے اس برتاؤ کا ایسا اثر ہوا کہ لوگ جوق در جوق آ کر آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے۔ مردوں کے ساتھ زنانِ قریش نے بھی ارکانِ اسلام کی پابندی اور محاسن کی پیروی کا عزمِ مصمم کیا۔ ابوجہل کی بہو اُمّ حکیم ایمان لا کر کہنے لگیں: ''یارسول اللہ! میرا شوہر عکرمہ جان بچا کر بھاگ گیا ہے' آپؐ اسے امان دے دیجئے''۔ آپؐ نے قبول فرمالیا۔ عکرمہ جو بدترین دشمن تھا' واپس آ کر جاں نثاروں کے زمرے میں شامل ہو گیا (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)۔ جنگِ اُحد میں آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے' چہرۂ انور زخمی ہو گیا' آپؐ گر گئے۔ بعض صحابہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ! ان لوگوں پر جنھوں نے آپؐ کو اس قدر دُکھ پہنچایا ہے' آپ بددعا کر دیجئے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا' بلکہ میں دعوت دینے والا اور رحمۃٌ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ نہیں جانتے''۔ عفو و درگزر کی صفت کا اظہار آپ ﷺ میں اس درجہ کمال پر ہوا کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔

کبریائی اللہ کی شان ہے۔ بندے کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ان اوصاف کا مالک بنے' بلکہ اسے انکساری اور تواضع پر کاربند ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انکساری کو اپنے نیک بندوں کا وصف قرار دیا ہے۔ اللہ کے پیارے حبیب محمد ﷺ نے مؤمنوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے۔ آپؐ خود بھی لوگوں سے تواضع و انکساری کے ساتھ پیش آتے تھے اور اسی کی رغبت بھی دیتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کے بہترین جاں نثار تھے۔ آپؐ کے لیے ہر وقت جان و مال اور گھر بار کی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔ لوگوں کے دلوں میں آپؐ کی بڑی

عظمت وعزت تھی، اس کے باوجود بھی آپؐ مغرور نہ تھے، بلکہ آپؐ کا رویہ شفیق باپ اور مہربان بھائی کا سا تھا۔ جب آپ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہوتے یا لوگوں کو زندگی کے آداب سے روشناس کراتے تو لطیف ترین انداز میں مخاطب ہوتے اور اس انداز سے گفتگو کرتے کہ طبیعت ذرہ برابر بھی کوفت محسوس نہ کرے۔ اسی طرح آپؐ کسی چیز میں نمایاں اور ممتاز ہونا پسند نہیں فرماتے تھے اور نہ ہی اچھا سمجھتے تھے کہ لوگ آپ کی تکریم میں کھڑے ہوں اور آپ کی مدح وتوصیف میں مبالغہ سے کام لیں، جیسا کہ گزشتہ اُمتوں نے اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کے ساتھ کیا تھا، یا آپ کو عبدیت یا رسالت کے درجہ سے بلند کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ کسی ناپسندیدہ آدمی کی آمد پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے اور اسے عزت دیتے۔ چنانچہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا جسے آپؐ اپنے گروہ کا ناپسندیدہ آدمی سمجھتے تھے، مگر آپؐ نے اس کے ہمراہ نہایت بے تکلفی سے بات کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس پر تعجب ہوا تو آپؐ نے فرمایا: ''قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص بدترین مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جلنا ترک کردیں''۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے یہاں ملاقات کے لیے جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوکر اطلاع دیتے اور اجازت لینے کے لیے تین مرتبہ سلام کرتے، جواب نہ ملنے پر بغیر کسی تکدر کے واپس چلے آتے۔ رات میں اگر کسی سے ملنے جاتے تو اتنی دھیمی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ جاگتا ہو تو سن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے۔

ایثار ایک عظیم اخلاقی صفت ہے۔ اس کا درجہ سخاوت سے بڑھ کر ہے۔ سخاوت یہ ہے کہ اپنا ضرورت سے زائد مال، وقت یا محنت دوسروں کے لیے صرف کیے جائیں، جبکہ ایثار کا مطلب یہ ہے کہ مال اگرچہ اپنی ضرورت کے لیے ہو لیکن دوسروں کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی جائے، اس میں خواہ اپنا نقصان ہوجائے مگر خوشنودیٔ الٰہی کی خاطر اسے خوش دلی سے گوارا کرلیا جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں تھا اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ بارگاہِ رسالت میں تشریف لائے اور عرض کیا کہ دعوتِ ولیمہ کے لیے گھر میں کوئی سامان میسر نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے انھیں حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا اور آٹے کی ٹوکری منگوائی، وہ جاکر لے آئے، حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔

خلقِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم میں کافر ومسلم، دوست ودشمن اور عزیز وبیگانہ کسی کی تمیز نہ تھی۔ ابرِ رحمت

دشت وچمن پر یکساں برستا تھا۔ انسان کے اخلاق کا امتحان بالعموم اُس وقت ہوتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ وہ دشمن کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ اخلاقِ نبویؐ کا آئینہ اسی بارے میں جلوے بکھیرتا ہے کہ جن کی تابناکیوں کے آگے انسان پیکرِ حسرت بن جاتا ہے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ دشمنوں سے اچھا برتاؤ کرو' بدخواہوں کے ساتھ نیکی کرو' بددعائیں دینے والوں کو دعائیں دو' خطاکاروں سے درگزر کرو اور ظالموں سے عدل وانصاف سے پیش آؤ۔ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک بدوی تشریف لایا اور کہنے لگا کہ اے نبی! ہم کو ایسی نعمت عطا فرمایئے جس پر عمل کرنے سے بہشت مل جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے چند مواعظ ونصائح فرمائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ''ظالم رشتہ داروں پر عنایت کی بارش کردو۔''

نبی اکرم ﷺ عیادت وتعزیت میں مسلم یا کافر کے لیے کوئی تخصیص نہیں کرتے تھے۔ کسی کی بیماری یا موت کی خبر سنتے ہی آپؐ اس کے گھر تشریف لے جاتے' مریض کے سرہانے بیٹھ کر شفقت ومحبت سے اس کا حال دریافت کرتے' مریض سے کھانے کے متعلق پوچھتے' کوئی چیز اگر وہ پسند کرتا اور مضرِ صحت نہ ہوتی تو بازار سے منگوا دیتے اور اس کی شفاء عاجل وکامل کی دعا فرماتے۔ جب کسی کی وفات ہوجاتی تو بھی آپ ﷺ تشریف لے جاتے' عالم نزع میں بلایا جاتا تو توحید اور توجہ الی اللہ کی تلقین کرتے۔ میت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار فرماتے' صبر کی نصیحت کرتے اور رونے چلانے سے منع کرتے۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ ساتھ چلتے۔ مسلمانوں کے جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کی دعائیں کرتے۔ کوئی جنازہ گزرتا تو کھڑے ہوجاتے اور تلقین کرتے کہ میت کے گھر والوں کے لیے لوگ کھانا پکوا کر بھجوائیں۔

رسول اکرم ﷺ کے حلم وبردباری کا یہ حال تھا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حلم مل کر بھی آپؐ کے برابر نہ تھا' حالانکہ صحابہ کرامؓ حلم ومسکنت کے حامل تھے۔ آپؐ کی حیثیت ان تمام معاملات میں سب کے لیے ایک شفیق' رحم دل اور مہربان معلم ومربی کی طرح تھی۔ حضور اکرم ﷺ نہ تو درشت گو تھے اور نہ ہی بے ہودہ گو۔ آپؐ برائی کا بدلہ برائی سے کبھی نہ دیتے' بلکہ عفوودرگزر فرمادیتے۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا کہ ''دو باتیں مجھ میں ایسی ہیں جن کو خدا پسند فرماتا ہے' ایک حلم وبردباری اور دوسری غوروفکر کے بعد کام کرنا''۔ ایک جگہ آپؐ نے فرمایا: ''غوروفکر کے بعد کام کرنا خدا کی طرف سے ہے اور جلدی کام کرنا شیطان کی طرف سے ہے''۔

نبی اکرم ﷺ کی مہمان نوازی کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ دربارِ رسالت میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آپؐ عزت سے ان کی خدمت کرتے اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر

مہمانوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ جو کچھ گھر میں ہوتا وہ مہمانوں کو پیش کر دیا جاتا اور نبی اکرم ﷺ خود اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن بھوکے رہ جاتے۔ رسولِ عربی ﷺ فرماتے تھے کہ ''جو شخص اللہ اور روزِ محشر پر ایمان رکھتا ہے تو چاہیے کہ مہمانوں کی عزت کرے''۔ اس وصف کو پورے عرب معاشرے میں اہم مقام حاصل تھا۔ چنانچہ اگر کوئی اجنبی بھی بطور مہمان ان کے گھر آتا تو پھولے نہ سماتے اور چاہتے کہ جو کچھ بھی میسر ہے لا کر مہمان کے سامنے رکھ دیں۔ یہ وصف عربی تہذیب کا انمول زیور تھا۔

رسول اکرم ﷺ عموماً زاہدانہ اور مسکینوں کا سا لباس پہنتے تھے۔ حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمارے سامنے ایک موٹی لنگی اور ایک پرانا کمبل نکالا جس پر پیوند لگا ہوا تھا' اور فرمایا کہ خیر البشر حضرت محمد ﷺ کی وفات انہی دو کپڑوں میں ہوئی تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات اور عمل سے لوگوں کو عدل و انصاف کا درس دیا۔ عدل و انصاف قائم کرنے میں آپ ﷺ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا کہ آپ لوگوں کے نزاعی معاملات میں فیصلہ کرنے کے لیے اللہ کی جانب سے مأمور ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں جہاں روزمرہ کی معمولی باتوں کو بے حقیقت تصور کیا جاتا تھا' آپ ﷺ کے دلِ وعدہ شناس میں اپنے قول کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عدیم النظیر احساس موجود تھا۔ تاجروں کا اخلاق عموماً ایفائے عہد کی جنس سے خالی ہوتا ہے' لیکن پیغمبر عالم ﷺ نے منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے بھی اپنے وعدوں کو اس خوبی سے پورا کیا اور انتہائی دیانت داری کا ثبوت دیا کہ اسی وجہ سے آپ ''امین'' کے لقب سے موسوم ہو گئے تھے۔

الغرض رسول اللہ ﷺ صاحب خلق عظیم تھے۔ آپؐ کی تخلیق کا مقصد ہی اعلیٰ اخلاق کو رواج دینا تھا۔ قرآن مجید نے جو اخلاقی سبق دنیا کو سکھایا آپ نے ان پر عمل پیرا ہو کر لوگوں کو بتا دیا کہ قرآن پاک ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ بالفاظِ دیگر محمد ﷺ کو قرآن کی عملی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ آپؐ کا انسانیت پر کامل احسان ہے کہ صداقت کی تعلیم دی تو خود صادق بن کر دکھایا' عفو و درگزر کا حکم دیا تو اس کو انسانی حوصلے تک روا رکھا' عدل و انصاف کا دامن تھامنے کو کہا تو اس صفت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ تحمل و بردباری' مہمان داری' غلاموں کے ساتھ حسن سلوک' غیر مسلموں کے ساتھ بہتر برتاؤ' جانوروں کے ساتھ رحم دلی' خلاصہ یہ کہ جو کہا خود کر دکھایا اور اس شان سے کیا کہ رہتی دنیا تک اس کی مثال قائم رہے گی۔ OO

عفوودرگزر

اسلامی اخلاق کاایک نمایاں وصف

پروفیسرمحمد یونس جنجوعہ

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ میں فضائل اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی سیرت وکردار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی تمام اخلاقی خوبیوں کا مرقع تھی۔ پھر آپ ﷺ کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ آپ لوگوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دیں اورانہیں مضبوط کردار وعمل سے مزین کریں۔

اخلاقی خوبیوں میں ایک اہم صفت عفوودرگزر ہے‘جس کا مطلب ہے دوسروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا‘ کوتاہیوں اورخطاؤں سے درگزر کرنا‘ انتقام لینے کی طاقت ہونے کے باوجود معاف کردینا اورمؤاخذہ نہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھرکسی شخص سے بدلہ نہیں لیا جس نے آپ ﷺ کو اذیت پہنچائی‘ برا بھلا کہا‘ بدسلوکی کی یا زخمی کیا۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ اپنے دشمنوں سے عفوودرگزر کا معاملہ فرمایا۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوئے تو آپ کے سامنے وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے آپ کوستانے میں کوئی کسر نہ اٹھارکھی تھی۔ مگرآپ ﷺ نے ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ فرما کراُن کومعاف کردیااور بدلہ نہ لیا۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ایک نام ’’العفو‘‘ ہے‘ یعنی سراسر معافی ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود بے حساب معاف کرنے والا ہےاور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے :﴿وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ﴾(الشوریٰ:۲۵) ’’وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے‘‘۔ بلکہ جب کوئی گناہگار اللہ کی گرفت سے خوف کھا کر سچی توبہ کرتا ہے‘ اپنے قصوروں پرنادم ہوتا ہےاور آئندہ زندگی میں پھران گناہوں کے قریب نہیں جاتا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو نہ صرف معاف کر

دیتا ہے بلکہ انہیں نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿...... اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمۡ حَسَنٰتٍؕ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۷۰﴾﴾ (الفرقان) ''......مگر جس کسی نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھا عمل کیا تو اللہ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔ انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے اکثر و بیشتر وہ اس کی اپنی ہی غلطیوں کا نتیجہ ہوتا ہے' مگر اللہ تعالیٰ مہربانی فرماتے ہوئے ہر گناہ اور خطا پر گرفت نہیں کرتا' بلکہ عفو کا معاملہ فرماتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَاۤ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَیَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۳۰﴾﴾ (الشوریٰ) ''اور جو مصیبت بھی تم پر واقع ہوتی ہے سو وہ تمہارے اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کا بدلہ ہوتا ہے' اور بہت سے گناہ تو اللہ تعالیٰ معاف بھی کر دیتا ہے''۔

خطا کار کو معاف کر دینا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ خود رحمٰن اور رحیم ہے اور اپنے بندوں کی خطاؤں کو معاف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا یہ وصف نمایاں ہوتا ہے کہ وہ انتقام لینے کی بجائے معاف کرنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ تقریباً دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم رہے مگر اُن دس سالوں میں آپ نے نہ انہیں کبھی ڈانٹ پلائی اور نہ ہی سخت سست کہا' حالانکہ وہ نوعمر تھے اور کام کرنے میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ آپؓ خود اعتراف کرتے ہیں کہ مدینہ میں مَیں دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا اور میں نوعمر لڑکا تھا' اس لیے میرا ہر کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے بالکل مطابق نہیں ہوتا تھا' لیکن (دس سال کی) اس مدت میں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اُف تک بھی نہیں کہا اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا یا یہ کیوں نہیں کیا؟ (سنن ابی داؤد)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ، فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ)) (رواہ البیھقی فی شعب الایمان) ''ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ پس مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین وہ ہے جو اُس کے کنبے کے ساتھ حسن سلوک کرے''۔ چنانچہ مخلوق کے ہر فرد کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی کا برتاؤ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ خاص طور پر جب کوئی شخص کسی مصیبت زدہ کے لیے ہمدردی کا اظہار کرے اور اُس کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کرے' لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرے' تو اس کا یہ عمل بہت بڑے اجر وثواب کا باعث ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلی کسی اُمت میں ایک آدمی تھا۔ جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو اس سے پوچھا کہ تو نے دنیا میں کوئی نیک عمل کیا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ میرے علم میں میرا کوئی عمل نہیں ہے۔ اس سے کہا گیا ذرا غور سے نظر ڈال! اس نے پھر عرض کیا کہ میرے علم میں کوئی چیز نہیں سوائے اس کے کہ میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور لین دین کرتا تھا تو میرا رویہ ان کے ساتھ درگزر اور احسان کا ہوتا تھا۔ میں پیسے والوں کو بھی مہلت دیتا تھا اور غریبوں اور ناداروں کو تو معاف بھی کر دیتا تھا۔ تو اللہ نے اُس شخص کے لیے جنت میں داخلے کا حکم فرما دیا۔ (متفق علیہ)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپ ﷺ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموش رہے۔ اس نے پھر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر روز ستر مرتبہ''۔ (جامع ترمذی) ستر دفعہ کہنا عربوں کا محاورہ ہے۔ گویا قصور معاف کرنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی حد مقرر کی جائے۔ خادم کے قصور معاف ہی کرتے رہنا چاہیے۔ قصور معاف کرنا بہت اونچے درجے کی نیکی ہے جو انسان کی قدر و منزلت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے پروردگار! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزت ہیں؟ ارشاد ہوا: ''وہ بندے جو (قصوروار پر) قابو پا لینے کے بعد (اور سزا کی طاقت رکھنے کے باوجود) اس کو معاف کر دیں''۔ (شعب الایمان للبیہقی)

ایک شخص نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیں۔ اُس وقت رسول اللہ ﷺ بھی پاس کھڑے تھے۔ وہ آدمی گالیاں دے رہا تھا' حضرت ابوبکر صدیقؓ خاموش کھڑے تھے اور رسول اللہ ﷺ تبسم فرما رہے تھے۔ جب اس آدمی نے بہت زیادہ بدزبانی کی تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کی بعض باتوں کو اس پر الٹ دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ ناراضگی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر چل دیے۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کے پیچھے چل پڑے اور عرض کیا یارسول اللہؐ! یہ کیا بات تھی کہ وہ شخص مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپؐ وہاں تشریف فرما رہے' پھر جب میں نے کچھ جواب دیا تو آپ ناراض ہو کر چل دیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تم خاموش تھے اور صبر کر رہے تھے تو تمہارے ساتھ اللہ کا ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا' پھر جب تم نے خود جواب دیا تو (وہ فرشتہ تو چلا گیا اور) شیطان بیچ میں آ گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے

فرمایا: اے ابوبکر! تین باتیں ہیں جو سب کی سب بالکل حق ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جس بندے پر کوئی ظلم وزیادتی کی جائے وہ محض اللہ کے لیے اس سے درگزر کرے (اور انتقام نہ لے) تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کی بھرپور مدد فرمائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص صلہ رحمی کے لیے دوسروں کو دینے کا دروازہ کھولے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو اور زیادہ دیں گے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ آدمی اپنی دولت بڑھانے کے لیے سوال کا دروازہ کھولے گا، یعنی بھیک مانگنا شروع کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دولت کو اور زیادہ کم کر دیں گے۔ (مسند احمد)

دنیا کی زندگی میں عفو ودرگزر کی عادت اختیار کرنا بڑی خوبی کی بات ہے، کیونکہ حساب کتاب کے دن ہر شخص کی خواہش ہوگی کہ اُس کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔ تو جو شخص دنیا کی زندگی کے معاملات میں دوسروں کے ساتھ نرمی اور درگزر کا عادی ہوا اللہ تعالیٰ حساب کتاب کے وقت اُس کے ساتھ بھی نرمی کا معاملہ فرمائے گا۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس ضمن میں ایک سبق آموز واقعہ بیان کرتے ہیں کہ دہلی شہر میں ایک شخص نان چنے بیچتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ اگر کوئی کھوٹا پیسہ بھی دے دیتا تو لے لیتا اور واپس نہ کرتا۔ اپنے اس رویے کی بدولت وہ شہر میں مشہور تھا۔ بچے تو اکثر کھوٹے سکے لے کر آتے اور اس سے نان چنے لے کر کھاتے۔ اس شخص کی وفات کا وقت آیا تو اس نے شہر کے ایک متقی بزرگ کو بلایا اور کہا کہ میری وجۂ شہرت بتائیے۔ بزرگ کہنے لگے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ تم گاہک کا کھوٹا کھرا نہیں دیکھتے، بلکہ جو بھی کوئی دیتا ہے قبول کر لیتے ہو۔ اس پر اُس نے اس متقی بزرگ سے کہا کہ آپ گواہ رہیں اور جب میرا حساب کتاب ہونے لگے تو کہہ دینا اے اللہ یہ تیرے بندوں کا کھوٹا کھرا نہیں دیکھتا تھا لہٰذا تو بھی اس کے کھوٹے کھرے کو نہ دیکھ اور اسے معاف کر دے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ مہربان ربّ میری خطائیں معاف کر دے گا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اگرچہ ظلم وزیادتی کا بدلہ لینا جائز ہے مگر فضیلت اور عزیمت اسی میں ہے کہ بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود محض اللہ کی رضا کے لیے معاف کر دیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا

وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَی اللّٰهِ ؕ﴾(الشوریٰ: ۴۰) ’’اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے‘ مگر جو درگزر کرے اور (معاملے کو) درست کر دے تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے‘‘۔ گویا جو شخص قصوروار کو معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور ایسے شخص کو ثوابِ عظیم سے نوازتا ہے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو عفو و درگزر پسند ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مسکرا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یارسول اللہ کون سی چیز ہنسی کا سبب ہوئی؟ آپؐ نے فرمایا: میرے دو اُمتی اللہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ایک کہتا ہے یاربّ اس نے مجھ پر ظلم کیا‘ میں بدلہ چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظالم سے فرماتا ہے کہ اپنے ظلم کا بدلہ ادا کرو۔ ظالم جواب دیتا ہے یاربّ! اب میری کوئی نیکی باقی نہیں رہی کہ ظلم کے بدلہ میں اسے دے دوں۔ اس پر وہ مظلوم کہتا ہے کہ اے اللہ! میرے گناہوں کا بوجھ اس پر لاد دے۔ یہ کہتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آبدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے کہ وہ بڑا ہی سخت دن ہوگا۔ لوگ چاہیں گے کہ اپنے گناہوں کا بوجھ کسی اور کے سر دھر دیں۔ اب اللہ تعالیٰ طالب انتقام سے فرمائے گا کہ نظر اٹھا کر جنت کی طرف دیکھ۔ وہ سر اٹھائے گا‘ جنت کی طرف دیکھے گا تو عرض کرے گا یاربّ! اس میں تو چاندی اور سونے کے محل موتیوں کے بنے ہوئے ہیں! یاربّ! یہ محل کس نبی‘ صدیق اور شہید کے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جو اِس کی قیمت ادا کرتا ہے اس کو دے دیے جاتے ہیں۔ وہ کہے گا یاربّ! اس کی قیمت کون ادا کرسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ اب وہ عرض کرے گا یاربّ کس طرح؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا وہ اس طرح کہ تو اپنے بھائی کو معاف کر دے۔ وہ کہے گا یاربّ میں نے معاف کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب تم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دن تو عمل کا نہیں بلکہ جزا کا ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ اس دن طالب انتقام کو معاف کرنے کا موقع دیتا ہے جس کے نتیجہ میں ظالم اور مظلوم دونوں کو جنت میں داخل فرما دیتا ہے! یہ اشکال اُس وقت بے حقیقت ہو جاتا ہے جب یہ یقین پختہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ **یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ** اور **یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ** کی شان رکھتا ہے۔ اس کی کوئی صفت محدود نہیں اور پھر اس کی رحمت تو ہر چیز پر غالب ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو حقوق اللہ کی کوتاہیاں بھی معاف کر دے گا اور حقوق العباد میں قصور بھی۔ اس کے سامنے کوئی

رکاوٹ نہ ہوگی۔ گویا معاف کرنا اللہ تعالیٰ کی کریمانہ صفت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی اسی صفت کے ساتھ متصف دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ایک مسنون دعا کے الفاظ اس طرح ہیں: اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفُوَ فَاعْفُ عَنِّیْ (ترمذی) ''اے اللہ تُو تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے، پس مجھے معاف فرما دے''۔

معاف کرنا نہایت اونچے درجے کے ثواب کا کام ہے، مگر اس کی بھی کچھ حدود ہیں۔ جہاں اس بات کی قوی امید ہو کہ زیادتی کرنے والے کا رویہ بدلا ہوا ہے اور وہ معافی ملنے کی صورت میں اپنی اصلاح کرلے گا وہاں تو معاف کرنا مستحسن ہے، مگر جہاں اس بات کی توقع نہ ہو اور اس کے آثار نظر نہ آئیں وہاں انتقام لینا ہی بہتر ہے، تاکہ مجرم اپنے کیے کا بدلہ پائے اور دوسروں کو عبرت ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اسلامی عدالت سے سزا پائے تو اس کی معافی کا بھی کسی کو اختیار نہیں رہتا۔ یعنی چوری ثابت ہو جانے پر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور قاتل کو موت کی سزا دی جائے گی۔ OO

*

تعلیم وتعلّم

اسلامی درسگاہوں میں
تعلیم قرآن کا جامع اور صحیح طریقہ
رائج کرنے کی ضرورت

محمد بشیر ☆

یہ امر کسی صاحب علم سے مخفی نہیں ہے کہ ہمارے ملک بلکہ برصغیر پاک و ہند کے پورے علاقے کی اسلامی درسگاہوں بلکہ سرکاری سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی' قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کا جو طریقہ عرصہ دراز سے رائج چلا آ رہا ہے وہ 'ترجمہ قرآن کریم' کے نام سے معروف ہے۔ یہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے مرحلے میں تین چار سال تک جاری رہتا ہے۔ اس کی تدریس یوں ہوتی ہے کہ درس کے آغاز پر ایک طالب علم مقررہ آیات تلاوت کرتا ہے' پھر معلم ان آیات کریمہ کا اپنی مقامی زبان اردو' پشتو یا سندھی وغیرہ میں ترجمہ سکھاتا ہے۔ وہ ان کا ترجمہ کرتے ہوئے ان میں مذکور مشکل الفاظ اور تراکیب کی حسب ضرورت تشریح بھی کرتا جاتا ہے۔ طلبہ اور طالبات اس ترجمہ اور تشریح کو نہایت توجہ اور انہماک سے سنتے ہوئے یاد کر لیتے ہیں۔ کچھ مدرسین اور شیوخ خصوصاً تفسیر قرآن کے مرحلے میں قرآنی مطالب کی تفسیر کو املا بھی کرا دیتے ہیں۔

بلاشبہ قرآن کریم کی تعلیم و تدریس اور تفسیر کے اس منہج سے زیر تعلیم طلبہ کو متنوع تعلیمی اور دینی فوائد حاصل ہوتے ہیں: (۱) وہ قرآن کریم کے لفظی اور بامحاورہ معنی سیکھ لیتے ہیں۔ (۲) وہ قرآن کریم کے الفاظ اور تراکیب کو سمجھنے لگتے ہیں اور کسی حد تک ان کی لغوی' صرفی اور نحوی تشریح سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ (۳) وہ قرآن حکیم کا ترجمہ اور تشریح نیز تفسیر پڑھ کر اس کے متن کے براہِ راست فہم و مطالعہ کی اہلیت حاصل کر لیتے ہیں' اور قرآنی احکام اور ارشادات

☆ مدیر معهد اللغة العربية' اسلام آباد

سے استفادہ کے اہل ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ ان متعدد فوائد کی بنا پر 'ترجمہ قرآن حکیم' کا یہ مضمون ہماری تمام چھوٹی اور بڑی درسگاہوں میں جاری و ساری ہے اور اس کی افادیت پر تمام علماء اور مدرسین کا اتفاق ہے۔

تنقیدی نظر

میں اس امر سے اتفاق کرتا ہوں کہ ترجمہ قرآن کریم کی تدریس سے مذکورہ بالا فوائد حاصل ہوتے ہیں، اور اس مضمون کے مروّجہ طریقۂ تدریس کی اتنی افادیت ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ لیکن قرآن کریم کی تعلیم و تدریس کے یہ فوائد خود ناکافی اور محدود ہیں اور یہ اس کی تعلیم و تدریس کے کئی بنیادی تعلیمی مقاصد کا احاطہ نہیں کرتے، کیونکہ یہ طریقۂ تدریس عالمی سطح پر مسلّمہ تعلیمی معیار پر پورا نہیں اترتا اور بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے کم از کم لازمی تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتا۔ چنانچہ انہی اسباب کی بنا پر ہمارے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے کئی اہم اور بنیادی گوشے تشنہ رہ جاتے ہیں۔ مملکت پاکستان میں ہماری دینی اور تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے لیے جس سطح کے ماہر معلمین، اساتذہ، علماء اور اسکالرز کی ضرورت ہے ان کی تعلیم و تربیت میں بھی یہی ناقص طریقۂ تدریس نافذ و غالب ہے، اس لیے بہتر نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ اس طریقۂ تدریس کے فوائد کے مقابلے میں نقصانات زیادہ ہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس میں زیرِ تعلیم بچوں کو قرآن کریم کی آیات کریمہ کا صرف مقامی زبان میں ترجمہ کرنے پر لگا کر اس کی آسان عربی زبان اور ادب کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور انہیں اس کو لکھنے یا بولنے کی کوئی تربیت نہیں دی جاتی، بلکہ انہیں ایسی تربیت یا مشق سے کئی سال تک مسلسل لاتعلق رکھتے ہوئے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اتنا جامد کر دیا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ عربی زبان و ادب میں اچھی صلاحیت یا بلند مقام کا سوچ بھی نہیں سکتے، اور اس بارے میں ہمیشہ کے لیے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس لیے تعلیم قرآن کریم کے مروّجہ طریقۂ تدریس کی فوری اصلاح کرتے ہوئے اسے اپنے قومی اور ملی مقاصد اور تعلیم و تربیت کے جدید تقاضوں کے مطابق ترقی دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ میں دینی مدارس کے اساتذہ، مہتمم حضرات اور تعلیمی وفاقوں کے ذمہ دار بلند مرتبہ علماء اور شیوخ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری ان گزارشات پر توجہ فرمائیں۔ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ، وَمَا تَوۡفِيۡقِىۡ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

*

ہمارے پورے تعلیمی نظام کا اہم ترین مضمون تعلیم قرآن کریم ہے اور زیر تعلیم طلبہ وطالبات کواس کی بہتر تعلیم وتفہیم کی خاطر انہیں عربی زبان وادب اور حدیث وفقہ نیز اصول کے کئی علوم وفنون کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔اس لیے ایک ایسی جماعت جسے ہم مستقبل میں اُمت کی تعلیمی اور فکری قیادت کے لیے تیار کر رہے ہیں اور وہ عنقریب معلم' ادیب' مفتی وخطیب اور محدث ومفسر کی عظیم ذمہ داریوں کوسنبھالیں گے' کو کتاب اللہ اور فرقانِ حمید کی تعلیم وتدریس کا طریقہ اور منہج ایسا جامع' منظّم اور مثالی ہونا چاہیے جو انہیں قرآنی الفاظ اور عبارتوں کا ترجمہ سکھانے کے ساتھ ساتھ ان کی عمدہ فکری' لسانی اور ادبی تربیت ومہارت کی اساس بن سکے۔

صرف لفظی ترجمہ رٹنے کا متعدی مرض

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ تعلیم قرآن کریم کا یہ عظیم ترین مضمون اس کی عبارت کا صرف لفظی اور زبانی ترجمہ رٹنے اور رٹانے تک محدود چلا آ رہا ہے اور تین چار سال تک اسی نہج پر چلتا رہتا ہے' اور ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا کہ اس مضمون کے دوسرے سال یا اگلے سالوں میں اس کے تعلیمی مقاصد یا تدریسی نہج میں مزید ترقی کرتے ہوئے اس میں مزید تعلیمی مقاصد کا اضافہ کر دیا جائے۔ نتیجتاً معلمین اور طلبہ وطالبات سب کی نظریں اسی لفظی ترجمہ کو پڑھنے اور پڑھانے اور یاد کرنے تک مرکوز اور محدود رہتی ہیں۔ رہا قرآن کریم کا اصل عربی متن تو وہ ان سب کی نظروں سے اس قدر اوجھل رہتا ہے کہ اس پورے عرصے میں انہیں اس کی عبارتوں' استعمالات اور الفاظ کے فہم ومطالعہ پر کوئی بحث یا مشق نہیں کرائی جاتی۔اس لیے وہ قرآن کریم کے نہایت آسان عربی استعمالات اور محاوروں سے بھی ناواقف رہتے ہیں اور مشہور قرآنی افعال کے مادوں اور ان کے صلات تک کو نہیں سمجھتے۔

ہماری اسلامی درسگاہوں میں تعلیم قرآن ایسے بنیادی اور اہم اسلامی مضمون کا یہ جمود نسل در نسل چلا آ رہا ہے اور اس نے ہمارے لاکھوں ذہین اور محنتی نوجوانوں کی تعلیم وتربیت پر کئی منفی اثرات ڈالے ہیں' جن میں سے سب سے زیادہ نمایاں نقصان یہ ہے کہ ان لاکھوں نوجوانوں کو کتاب حکیم کی عربی زبان وادب کے فہم ومطالعہ سے اس حد تک محروم رکھا جاتا ہے کہ اس کی تدریس تین چار سال کا طویل عرصہ جاری رہنے کے باوجود معلمین یا طلبہ کو اس پر عربی زبان میں چند صفحات لکھنے یا بولنے کی مشق نہیں کرائی جاتی۔

آپ کو شاید دنیا کے کسی ترقی یافتہ تعلیمی نظام میں کسی کتاب یا کورس کا محض لفظی ترجمہ

رٹانے کے اس جمود کی ایسی کوئی مثال نہ ملے جو ہماری درسگاہوں میں سالوں تک جاری رہتا ہے' اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ جمود عرصہ دراز سے چلا آ رہا ہے۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عام لوگ جو کسی مستند تعلیمی درسگاہ میں نہ پڑھتے ہوں وہ اگر اپنی کاروباری مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر صرف ترجمہ قرآن کریم پڑھیں تو یہ ان کے لیے بہت کام کی بات ہے' کہ وہ اس طرح قرآن کریم کے الفاظ کا لفظی ترجمہ یاد کر کے اللہ تعالیٰ کے احکام اور ارشادات سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ لیکن جس گروہ نے اپنی عمروں کا بہترین وقت کسب وتعلّم کے لیے وقف کیا ہوا ہے اور وہ اسلامی تعلیم اور عربی زبان کے تمام بنیادی علوم وفنون کو سالہا سال پڑھیں گے اور مستقبل میں بلند علمی مناصب پر فائز ہوں گے' کیا وہ بھی ان عام لوگوں کی طرح سالوں تک قرآن کریم کا صرف لفظی ترجمہ ہی رٹتے رہیں؟

ایسی صورت حال میں یہ لازمی اور مفید ہوگا کہ جب ان میں مناسب صلاحیت موجود ہوتی ہے اور وقت کی گنجائش بھی ہوتی ہے تو انہیں اس کتاب حکیم کا مقامی زبان میں ترجمہ کرنے کے علاوہ اس کی آسان اور مبارک عربی لغت' محاوروں اور استعمالات پر مفید معلومات فراہم کی جائیں' اور پھر ان معلومات کو ان کے ذہنوں میں راسخ کرنے اور ان کے عملی استعمالات کی تربیت دینے کی غرض سے ان سے متنوع مشقیں حل کرائی جائیں۔

ہم تعلیم قرآن اور عربی زبان کے اچھے معلم کیوں تیار نہ کر سکے؟

ہماری عظیم درسگاہوں میں کتابُ اللہ کی تعلیم وتدریس جس سادہ اور ناقص طریقے پر چلی آ رہی ہے اس کے مضر اثرات کی وسعت کا جائزہ لینے کے لیے ان پہلوؤں پر غور کرنا مفید ہوگا:

اوّلاً: ہمارے طلبہ اور طالبات اپنی نوعمری میں پوری لگن اور شوق سے اپنا تعلیمی سفر شروع کرتے ہیں' اس لیے یہ ان کی عمدہ تعلیم' بہتر تربیت اور تخلیقی صلاحیتوں کی اچھی نشو ونما کا سنہری وقت ہوتا ہے۔ اور انہیں عربی زبان کو لکھنے اور بولنے کا ابتدائی سلیقہ اور تربیت دینے کا بھی یہی فطری وقت ہوتا ہے' لیکن چونکہ ہماری درسگاہوں میں مروّجہ طریقۂ تدریس کا زیادہ زور عربی عبارتوں کا لفظی ترجمہ رٹنے اور صرف ونحو کی گردانوں اور قواعد کو استعمالات کے بغیر یاد کرنے پر ہی رہتا ہے' اس لیے ہمارے نہایت ذہین اور محنتی بچے بھی عربی ایسی آسان زبان کو لکھنے اور بولنے کی مشق نہیں کرتے' اور وہ قدرتی طور پر اس پہلو میں جمود کا شکار ہوتے ہیں' جو آگے جا کر عملی زندگی میں ان کے لیے طرح طرح کی مشکلات کا باعث بنتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ

*

اس وقت جو طریقۂ تدریس ہمارے ہاں رائج ہے اس میں طالبعلم سورۃ الفاتحہ سے لے کر وَالنَّاسِ تک پڑھتے ہوئے عربی میں چند صفحات بھی لکھنے کی مشق نہیں کرتا۔

ثانیاً: پھر اس ایک مضمون کے طریقۂ تدریس کی پسماندگی صرف اس ایک مضمون تک محدود نہیں ہے، بلکہ اکثر معلمین تعلیم وتدریس کے فن سے ناآشنا ہوتے ہیں اور مدارس کی انتظامیہ بھی انہیں فن تعلیم میں تربیت اور تدریب کے مواقع فراہم نہیں کرتی، اس لیے وہ اس پرانے طریقۂ تدریس کو آسان اور چلتا ہوا سکہ خیال کرتے ہوئے اپنائے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت ہماری درسگاہوں میں اکثر مضامین کی تدریس اسی لفظی اور زبانی ترجمہ اور تشریح تک محدود رہتی ہے اور یہ طرزِ تدریس سال اول سے لے کر شہادۃ العالیۃ اور شہادۃ العالمیۃ تک بلکہ اس سے بھی آگے تخصص کی اقسام (تخصص فی التفسیر، تخصص فی الحدیث، تخصص فی الفقہ، تخصص فی الافتاء وغیرہ) اور یونیورسٹی کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کورس میں بھی جاری رہتا ہے۔ یوں کاہلی اور جمود کا یہ متعدی مرض نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔

ثالثاً: ہمارے عربی مدارس اور اسلامی درسگاہوں میں رائج اس ناقص اور مضر طریقۂ تدریس کا ایک وسیع اور قومی سطح کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ یہ درسگاہیں آج تک سرکاری اور غیر سرکاری سکولوں اور کالجوں میں عربی زبان وادب اور اسلامی علوم کی معیاری تدریس کے لیے اچھے معلمین اور اساتذہ تیار نہیں کرسکیں، کیونکہ جن معلمین نے خود ایسے ماحول میں تعلیم پائی ہوتی ہے وہ عملی زندگی میں تدریس کا جدید اور ترقی یافتہ انداز اپنانے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ مسلّمہ قاعدہ ہے: **فَاقِدُ الشَّیْءِ لَا یُعْطِیْہِ** (جو شخص خود کسی خوبی سے محروم ہو وہ اسے دوسروں کو نہیں دے سکتا)۔ انہی اسباب کی بنا پر ہم قیامِ پاکستان کے بعد آج تک ماہر معلمین اور اساتذہ کی تیاری کے اس خلا کو پر نہیں کر سکے۔

اپنا مختصر تعارف

چونکہ زیر بحث مسئلہ ملک بھر کے اسلامی مدارس کے نظام تعلیم سے متعلق ہونے کی وجہ سے نہایت اہم ہے اور عمیق غور وفکر کا متقاضی ہے اس لیے میں اس موقع پر محترم علماء اور اساتذہ کی اطلاع اور اطمینان کے لیے اپنا مختصر تعارف عرض کرنا مفید خیال کرتا ہوں۔

میں یہ گزارشات بتوفیقہ سبحانہ وتعالیٰ تعلیم وتربیت کے میدان میں اپنے طویل تجربات اور غور وفکر کی روشنی میں ان عظیم اسلامی درسگاہوں کو بہتر علمی وتعلیمی ترقی دینے کی غرض سے پیش

کرر ہا ہوں۔ میں خود متعدد اسلامی درسگاہوں کا بانی ہوں' اور دن رات ان کے بہتر اور ترقی یافتہ نصاب کی ترتیب وتصنیف میں مشغول رہتا ہوں۔ ماضی میں ملت کے جن اکابر علماء اور مفکرین سے میرا کسی طرح کا تعلق رہا ہے میں ان کی قیمتی آراء سے استفادہ کرتے ہوئے ہی اسلامی علوم اور عربی زبان کی خدمت کرر ہا ہوں۔ان میں اوّلاً میرے اساتذہ مولانا عبدالغفار حسن' محدث مولانا حافظ محمد گوندلوی' مولانا معاذ الرحمٰن' مولانا عبداللہ امرتسری' مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل اور مولانا مفتی ابوالبرکات مدراسی ہیں۔ان کے علاوہ مولانا عبدالرحیم اشرف' مفتیٔ پاکستان مولانا محمد شفیع (ان کی جو تقریر اب ''وحدتِ اُمت'' کے عنوان سے چھپتی ہے اسے انہوں نے پہلی بار مولانا عبدالرحیم اشرف کی درخواست پر ہمارے ادارے جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں بیان فرمایا تھا' پھر راقم نے اسے کیسٹ سے قرطاس پر منتقل کیا تھا)' محدث مولانا محمد یوسف بنوری' مولانا محمد اسماعیل سلفی' مولانا محمد حنیف ندوی' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' مولانا امین احسن اصلاحی' مولانا خلیل احمد حامدی' مولانا عطاء اللہ حنیف' مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی' مولانا منظور احمد نعمانی' اور معلم الانشاء کے مؤلف مولانا عبدالماجد ندوی' نیز اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ کے وائس چانسلر اور سعودی عرب کے مفتی اکبر شیخ عبدالعزیز بن باز اور **طریقة جدیدة** کے مؤلف ڈاکٹر احمد امین مصری کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ **رحمهم الله جَمِیْعا وغفر لهم ورفع درجاتهم۔**

میں ۱۹۷۳ء کے آخر میں اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ میں اعلیٰ تربیتی کورس کے لیے گیا تو میرے ہمراہ محترم ڈاکٹر شیر علی اور مولانا محمود اشرف بھی تھے۔ میں اس سے پہلے ہی پاکستان میں عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم کی جدید نہج پر تدریس کرر ہا تھا۔مولانا عبدالرحیم اشرف کی سرپرستی میں سات آٹھ سال جامعہ تعلیمات اسلامیہ میں بہت عمدہ تجربات ہوئے اور یہیں سے نصابی کتابوں کی تصنیف شروع کی۔ بعدازاں چند ماہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی قرآن اکیڈمی اور جامعہ اشرفیہ میں عربی زبان کی تدریس کرتا رہا۔ وہاں کے بزرگوں مولانا عبیداللہ' مولانا عبدالرحمٰن اشرفی اور مولانا فضل الرحیم سب کا اعتماد اور تعاون حاصل رہا۔

اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ میں اپنے قیام کے دوران مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی تو اُن سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اُس وقت کے نصابِ تعلیم اور برصغیر پاک وہند میں عربی زبان وادب کی اشاعت پر تبادلہ خیال ہوتا۔ وہ اکثر میری سوچ

*

اور جذبہ عمل کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ایک بار انہوں نے حرم مکی میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''بشیر صاحب! مملکت پاکستان میں عربی زبان کے ایک سپاہی کی ضرورت ہے اور وہ آپ ہی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا سفارت خانے کی ملازمت کو چھوڑ کر پاکستان جایئے!''

میں پہلے ہی اسی نظریے کو لے کر عالم عرب میں عربی زبان وادب کی ترقی کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کی غرض سے سعودی عرب گیا تھا۔ مزید کسی ڈگری یا سروس کا حصول میرا مقصد نہ تھا۔ اس سے قبل ان کی تصنیف 'پا جا سراغ زندگی' پڑھ چکا تھا اور اس سے متاثر تھا۔ اس لیے ان کی اس رائے سے میرے پرانے تصور کو تقویت ملی۔ میں نے جدہ کے پاکستانی سفارتخانے میں ملازمت کے دنوں میں اقرأ الجزء الاول کا مسودہ تیار کر لیا تھا اور الجزء الثانی کی ترتیب جاری تھی۔

آخر میں اپنے مہربان دوست اور تعلیم عربی کے عالمی ماہر جناب ڈاکٹر ف عبد الرحیم مؤلف کتاب **دروس اللغة العربية** (تین حصے) کا تذکرہ ضروری ہے۔ سعودی عرب میں اپنے قیام کے دوران اور کئی تعلیمی کانفرنسوں میں میرا ان سے تبادلہ خیال ہوتا' اور ان کے تجربات سے استفادہ کرتا۔

پس چہ باید کرد؟

اسلامی مدارس کے ابتدائی سالوں میں جو طلبہ اور طالبات عربی زبان اور اسلامی تعلیم کے مختلف علوم وفنون پڑھتے ہیں انہیں کتاب اللہ کی تعلیم وتدریس جدید تعلیمی نظریات اور تجربات کے مطابق اور عالمی سطح پر مسلّمہ اور معیاری طریقۂ تدریس کے مطابق کی جائے۔ جس کا خاکہ ذیل میں دیا جا رہا ہے' واللّٰہ الموفّق والمُستعان۔

اوّلاً: اس مضمون کا موجودہ عنوان 'ترجمہ قرآن کریم' بدل کر اسے تعلیم القرآن الکریم یا تدریس القرآن الکریم کا نام دیا جائے۔

ثانیاً: ان طلبہ اور طالبات کے لیے تدریس القرآن الکریم کے ہر سبق میں درج ذیل تین اجزاء یا حصے ہوں گے:

۱- شرح الکلمات' ۲- ترجمة الآيات وشرحها' ۳-المناقشة

(۱) شرح الکلمات: معلم ہر سبق کے شروع میں اس کی مقررہ آیات کریمہ کے الفاظ

اور تراکیب کی لغوی تشریح کو تختہ سیاہ پر لکھے تاکہ بچے اسے اپنی کاپیوں میں درج کریں۔
اس جزء کے تیس (۳۰) نمبر ہوں گے۔

(۲) **ترجمة الآيات وشرحها**: بعدازاں معلم ان آیات کریمہ کا مقامی زبان میں ترجمہ کرے گا اور بچوں کے معیار کے مطابق ان کی تشریح کرے گا۔

اس ترجمہ کے پچیس (۲۵) نمبر اور تشریح کے پندرہ (۱۵) نمبر ہوں گے۔ یوں اس جزء کے کل چالیس (۴۰) نمبر ہوں گے۔

(۳) **المناقشة**: آخر میں معلم ان آیات کریمہ کے جملوں اور مضمون پر زیر تعلیم بچوں کے معیار کے مطابق آسان عربی زبان میں سوالات تختہ سیاہ پر لکھے گا اور بچے ان سوالات کے عربی میں جواب دینے کی زبانی مشق کریں گے اور بعد میں ان سوالات اور ان کے جوابات کو اپنی کاپیوں میں لکھیں گے۔

اس جزء کے تیس (۳۰) نمبر ہوں گے۔

مجوزہ تبدیلیاں

ملکی درسگاہوں میں کتابُ اللہ کی ایسی معیاری اور جامع تدریس کے لیے ہمیں اس کے موجودہ طریقۂ تدریس میں درج ذیل دو بڑی تبدیلیاں کرنا ہوں گی:

(۱) قرآن کریم کے الفاظ کی لغوی تشریح کو بہتر اور منظّم اسلوب میں پڑھایا جائے

اس وقت ترجمہ قرآن کریم پڑھاتے ہوئے اکثر معلمین قرآنی الفاظ کی جو تشریح کرتے ہیں وہ بہت کم اور سرسری ہوتی ہے' اور وہ بھی اکثر زبانی بتا دی جاتی ہے اور بچوں کو املا نہیں کرائی جاتی' اِلّا ماشاءَ اللہ۔ اس لیے اس سے زیر تعلیم بچوں کے ذہنوں میں لغوی معلومات کو راسخ کرنے میں چنداں مدد نہیں ملتی۔ یہ سلسلہ بہرحال کم سن بچوں کی تعلیم و تربیت میں بہت مفید ہے۔ اس لیے اسے زیادہ مؤثر اور منظّم صورت دینے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے دو باتوں کو واضح اور متعین کر لیا جائے۔

(۱) ان مطلوبہ لغوی معلومات کا دائرہ متعین کر لیا جائے۔

(۲) اور پھر انہیں جماعت کے طلبہ کو پیش کرنے کا طریق کار واضح کر دیا جائے۔

*

(۱) مطلوبہ لغوی معلومات:

(۱) شروع میں صرف مشہور اور کثیر الاستعمال عربی افعال کا ماضی، مضارع، مصدر اور معنی بتائے جائیں۔

(۲) اگر آیت کریمہ میں اسم مفرد استعمال ہوا ہے تو اس کا معنی اور جمع بتائی جائے، اور جمع کی صورت میں اس کا معنی اور مفرد بتایا جائے، وغیرہ۔

جبکہ دو تین پارے پڑھنے کے بعد ان میں درج ذیل معلومات کا اضافہ کرلیا جائے:

(۱) مشہور افعال کے صلات یعنی ان حروفِ جر کا بتایا جائے جو اُن افعال کو متعدی بنانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، مثلاً قال کے بعدلِ کا استعمال۔ جیسے: ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ﴾، وغیرہ

(۲) قرآن کریم میں مستعمل متضاد کلمات نیز مترادف کلمات بتائے جائیں۔

(۳) اس مرحلے پر نسبتاً مشکل افعال اور اسماء کی تشریح بھی کی جائے۔

(۴) لغت قرآن، صرف ونحو نیز علم بلاغت کی آسان اور عام فہم دیگر ایسی معلومات جنہیں معلم بچوں کے معیار کے مطابق مناسب تصور کرے، بھی لکھائی جائیں۔

(مزید راہنمائی اور نمونے کے لیے دیکھئے دلیل قصص النبیین جزءاوّل، دوم اور سوم)

(۲) طریق کار: ان لغوی معلومات کو بچوں کو اس طریقے پر پڑھایا جائے:

(۱) معلم سبق پڑھانے سے قبل مقررہ آیات کے منتخب الفاظ کی تشریح تیار کر کے لائے۔

(۲) اور وہ اسے درس کے شروع میں بچوں کے سامنے تختہ سیاہ پر لکھے۔

(۳) اور بچے اسے آواز سے پڑھتے ہوئے یاد کریں اور اپنی کاپیوں میں لکھیں۔

(۴) اور معلم اس امر کا اہتمام کرے کہ تمام بچے ان معلومات کو اپنی اپنی کاپیوں میں لکھیں۔

(۲) عربی زبان کے استعمالات اور سوال وجواب کی مؤثر تربیت دی جائے

قرآن کریم کی عربی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے۔ اس کے الفاظ سہل اور عام فہم ہیں اور زیادہ تر چھوٹی چھوٹی ترکیبات اور مختصر جملے اور میٹھے میٹھے بول ہیں۔ پھر اہل زبان کے ہاں انتہائی معروف ومشہور محاورے اور استعمالات، اور اسلوب بیان اس قدر عام فہم کہ اوسط درجے کا قاری اسے بخوبی سمجھ لے۔ اس کی اس خوبی کو خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٩٢﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿١٩٤﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿١٩٥﴾﴾
(الشعراء)

نیز فرمایا:

﴿وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٣﴾﴾ (النحل)

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہم عجمی مسلمان ہیں اور ہماری مادری اور قومی زبان عربی نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے بچے قرآن کریم کی عبارت کو براہ راست عربی میں نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن ہم اپنی اس کمزوری کے ازالے کی خاطر اپنے زیر تعلیم بچوں کو قرآن کریم کے ابتدائی فہم کے لیے (۱) اس کے الفاظ، ترکیبوں، مشہور محاوروں اور استعمالات کی مناسب تشریح اور معنی یاد کراتے ہیں، نیز (۲) انہیں اس کی آیاتِ کریمہ کا پورا ترجمہ پڑھاتے ہیں، تو اب ان کے لیے کتابُ اللہ کے ابتدائی فہم و مطالعہ کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ پھر (۳) اس حقیقت کو مدنظر رکھیں کہ وہ ایک دینی درسگاہ کے طلبہ اور طالبات ہیں اور ابتدائی عربی زبان (نثر و نظم) کے کئی اسباق نیز علم صرف، علم نحو اور دوسرے کئی ایسے مضامین کو پڑھ رہے ہیں جو عربی زبان کے فہم اور استعمال میں معاون اور خادم ہیں۔ اس لیے اب وہ قرآن کریم کے اسباق میں ابتدائی سطح کی آسان عربی زبان میں سوال و جواب اور دیگر ایسی مشقوں کو حل کرنے کی اچھی قدرت رکھتے ہیں، جو ان کی مزید علمی اور لسانی ترقی میں معاون بنیں گی۔

اس لیے اس مرحلے پر معلم قرآن کریم کی آیاتِ کریمہ کے مضمون اور جملوں پر آسان عربی میں سوالات تیار کرے اور انہیں تختہ سیاہ پر لکھے۔ بچے انہیں سمجھیں اور پھر عربی میں ان کے جوابات بولیں۔ جہاں ضرورت ہو معلم ان کی مدد کرے۔ بعد میں بچے سوال و جواب کی ایسی مشقوں کو اپنی کاپیوں میں لکھیں گے اور معلم ان کی تصحیح کرے گا۔ جبکہ اس کورس کے تیسرے اور چوتھے سال میں طلبہ سبق کی مقررہ آیات کا عربی زبان میں مختصر خلاصہ بھی پیش کیا کریں گے۔

سورۃ الفاتحہ کی تدریس کی مثال

اب میں اپنی معروضات کو مزید واضح کرنے کے لیے اس مجوزہ تدریسی خاکے کے

*

مطابق سورۃ الفاتحہ کی تدریس کی مثال پیش کرتا ہوں۔

(۱) شرح الکلمات:

معلم سبق کے شروع میں سورۃ الفاتحہ کے الفاظ کی درج ذیل تشریح کو تختہ سیاہ پر لکھے گا‘ جسے طلبہ آواز سے پڑھتے ہوئے اپنی کاپیوں میں لکھیں گے۔

اَعُوْذُ : میں پناہ مانگتا ہوں	عَاذَ یَعُوْذُ اَوْ عِیَاذًا : پناہ مانگنا
بِاللّٰہِ: اللہ کی	مِنْ: سے
اَلشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ : راندہ ہوا شیطان	بِسْمِ: نام سے (اصل میں بِاسم تھا)
الرَّحْمٰنِ : بہت زیادہ رحم کرنے والا	اَلَّذِیْ یَرْحَمُ کُلَّ شَیْءٍ
اَلرَّحِیْمِ : سدا رحم کرنے والا	اَلَّذِیْ یَرْحَمُ دَائِمًا وَاَبَدًا
اَلْحَمْدُ: سب تعریفیں	حَمِدَ یَحْمَدُ حَمْدًا : تعریف کرنا
رَبٌّ: پروردگار (ج اَرْبَابٌ)	الْعَالَمِیْنَ : جہانوں (م عالِم)
یَوْمٌ: دن (ج ایّام)	اَلدِّیْنِ: بدلہ
اِیَّاکَ: صرف تیری ہی	
نَعْبُدُ: ہم عبادت کرتے ہیں	عَبَدَ یَعْبُدُ عِبَادَةً : عبادت کرنا
نَسْتَعِیْنُ: ہم مدد مانگتے ہیں	اِسْتَعَانَ یَسْتَعِیْنُ اِسْتِعَانَةً : مدد مانگنا
اِهْدِنَا: آپ ہماری راہنمائی کریں	هَدٰی یَهْدِیْ هُدًی: راہنمائی کرنا
اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ : سیدھی راہ	وَهُوَ سَبِیْلُ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ: جن پر تو نے انعام کیا	اَنْعَمَ یُنْعِمُ اِنْعَامًا : انعام کرنا
غَیْرِ : وہ لوگ نہیں	اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ: جن پر غضب ہوا
الضَّآلِّیْنَ: گمراہ لوگ	آمین: قبول فرما

(۲) ترجمۃ الآیات

پھر معلم جماعت کو اپنی مقامی زبان میں ترجمہ پڑھائے گا اور زیر تعلیم بچوں کے معیار کے مطابق اس کی تشریح کرے گا۔

(۳) المناقشۃ

التمرین الاوّل: اب تیسرے مرحلے پر معلم تختہ سیاہ پر سورۃ الفاتحہ کے بارے میں عربی میں درج ذیل سوالات لکھے گا جنہیں طلبہ آواز سے پڑھتے ہوئے اپنی کاپیوں میں درج کریں گے:

(۱) لِمَنِ الْحَمْدُ؟ (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ) (۲) مَنْ رَّبُّ الْعَالَمِیْنَ؟

(۳) مَنْ رَبُّ الْاِنْسَانِ؟ (۴) مَنْ رَبُّ الْحَیَوَانِ؟

(۵) مَنْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ؟ (۶) مَنْ رَبُّ الْاَرْضِ؟

(۷) مَنِ الرَّحْمٰنُ؟ (۸) مَنِ الَّذِیْ یَرْحَمُ کُلَّ شَیْءٍ

(۹) مَنِ الرَّحِیْمُ؟ (۱۰) مَنِ الَّذِیْ یَرْحَمُ دَائِمًا اَبَدًا؟

(۱۱) مَنْ نَعْبُدُ؟ (۱۲) مَنْ نَسْتَعِیْنُ؟

(۱۳) مَنْ یَھْدِیْنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ؟ (۱۴) مَنْ یُجِیْبُ دُعَائَنَا؟

سوالات کی تحریر سے فراغت کے بعد معلم جماعت کو ان کے عربی میں جواب دینے کی مشق کرائے گا اور حسب ضرورت ان کی مدد بھی کرے گا۔ بعد میں بچے سوال و جواب کی اس مشق کو اپنی کاپیوں میں حل کر کے لائیں گے جنہیں معلم چیک کر کے ضروری تصحیح کرے گا۔

التمرین الثانی: اب معلم طلبہ سے کہے کہ وہ اپنی کاپیوں میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی طرح کے عربی میں دس جملے لکھیں، مثلاً:

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰہ (۲) اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہ

(۳) اَلشُّکْرُ لِلّٰہ (۴) اَلْاَرْضُ لِلّٰہ وغیرہ۔

معلم کے لیے مزید مشق

اگر معلم چاہے اور وقت کی گنجائش موجود ہو تو طلبہ کو کہے کہ وہ اوپر کی مشق میں اپنے تمام عربی جملوں کے ترتیب وار سوالات بنائیں اور ان کے سامنے جوابات لکھیں، مثلاً:

(۱) لِمَنِ الْحَمْدُ؟

(۲) لِمَنِ التَّحِیَّاتُ؟ وغیرہ

خلاصہ

آپ دیکھ رہے ہیں کہ الحمد للہ ان آسان مشقوں کو حل کرتے ہوئے بچے قرآنی عربی

*

زبان کے پچاس ساٹھ جملے بآسانی لکھ بول رہے ہیں۔

بحث کے نتائج

(۱) اس وقت اسلامی مدارس میں تعلیم قرآن کریم کا مروّجہ طریقۂ تدریس (ترجمہ قرآن کریم) اس کی تعلیم وتدریس کے صرف چالیس فیصد مقاصد کو پورا کر رہا ہے جبکہ ساٹھ فیصد بنیادی مقاصد کو نظر انداز کرتا ہے، اس بنا پر ہمارے طلبہ وطالبات کی تعلیم وتربیت کے کئی اہم گوشے تشنہ رہ جاتے ہیں۔

(۲) قرآن کریم کی عربی زبان اور اسلوبِ بیان نہایت آسان اور پر کشش ہونے کے باوجود ہمارا طریقۂ تدریس اور معلمین زیر تعلیم بچوں کو ان کے عملی استعمال اور لکھنے بولنے کی تربیت نہیں دیتے، جس کے نتیجے میں وہ اپنی نوعمری میں اس نقص سے برا اثر لیتے ہوئے جمود کا شکار ہو جاتے ہیں۔

(۳) اپنے طلبہ اور طالبات کی بہتر اور معیاری تعلیم وتربیت کے لیے اس ناقص طریقۂ تدریس کی فوری اصلاح کرتے ہوئے اسے جدید تعلیمی تجربات اور تحقیق کے مطابق از سر نو ترتیب دینا ضروری ہے۔

(۴) اگر ہم اپنی درسگاہوں کے اس طریقۂ تدریس کی مناسب اصلاح اور ترقی کا اہتمام کرلیں تو ان کے طلبہ وطالبات کی علمی صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان درسگاہوں کا مقام اور وقار بڑھے گا۔

(۵) اور ان کے فضلاء کے لیے اندرون وبیرون ملک مختلف میدانوں میں کام اور ترقی کے وسیع اور اچھے مواقع میسر ہوں گے، اور وہ چھ یا آٹھ سالہ تعلیمی کورس مکمل کرنے کے بعد نہیں، بلکہ صرف تین سالہ کورس کرنے کے بعد عربی زبان اور اسلامیات کے اچھے معلم بنیں گے، نیز وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے عرب دنیا کی کسی یونیورسٹی میں داخلے کے اہل ہوں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ وھو الموفق والمستعان۔

تقاضے اور ضروریات

کما لا یخفی علی السادة العلماء والمدرسین قرآن کریم کی تعلیم وتدریس کو

ترقی دینے کی اس تجویز پر اگر صدق دل اور محنت سے عمل کیا گیا تو یہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری عظیم اسلامی درسگاہوں کے نصابِ تعلیم، طریقۂ تدریس اور مجموعی ماحول میں ایک مثبت اور تعمیری انقلاب کا ذریعہ بنے گی، اور ان کے اسلامی اور ملی کردار اور عظمت میں اضافہ ہوگا۔ اس لیے محترم علماء اور مدرسین کو کتاب اللہ اور دوسرے علوم شرعیہ کی تدریس میں موجود اس دیرینہ نقص کا فوری ازالہ کرتے ہوئے اپنے طلبہ و طالبات کی زیادہ معیاری تعلیم و تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس اصلاحی مہم میں ایسے حضرات کو زیادہ مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے جو ان عظیم اسلامی درسگاہوں کی ترقی کے لیے کام کر رہے ہیں، خصوصاً وہ حضرات جنہوں نے الجامعۃ الاسلامیۃ العالمیۃ اسلام آباد، الجامعۃ الاسلامیۃ مدینہ منورہ اور مکہ، ریاض یا قاہرہ وغیرہ کی دوسری یونیورسٹیوں اور اداروں سے کسب فیض کیا ہے۔

البتہ اس تجویز کے مناسب اور مؤثر نفاذ کے لیے دو چیزوں کی فوری ضرورت ہوگی:

(۱) قرآن کریم کی ایسی تدریس میں معلمین اور طلبہ و طالبات کی راہنمائی اور مدد کے لیے مناسب دلیل یا مرشد المعلم (Teacher's Guide) کی تیاری۔ **الحمد للّٰہ**، معہد اللغۃ العربیۃ میں اس کی تیاری اور تصنیف کئی سال سے جاری ہے۔

(۲) قرآن کریم کی اس نہج پر تعلیم و تدریس کی راہنمائی کے لیے معلمین اور معلمات کو کم از کم دو ہفتے کی تعلیمی تربیت دی جائے۔ یہ عملی تربیت وفاق کی سطح پر دی جا سکتی ہے۔ وفاق المدارس السلفیۃ نے گزشتہ ماہ فیصل آباد میں ۱۵۰ معلمین اور معلمات کی تربیت کا پہلا کورس مکمل کراتے ہوئے اس میدان میں پہل کر دی ہے۔ ان عظیم مقاصد کی تکمیل کے لیے ایسے تربیتی کورسز کے انعقاد سے ہماری درسگاہوں کی بہتر تعمیر و ترقی کے راستے کھلیں گے اور ان کے فضلاء کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر زیادہ پذیرائی حاصل ہوگی۔ ان کورسز کے انعقاد کے لیے موجودہ حکومت اور جامعۃ الدول العربیۃ (عرب لیگ) سے مناسب مالی اور فنی امداد لی جا سکتی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۞ ۞ ۞

مولانا عبدالحی لکھنویؒ

۱۲۶۴ھ تا ۱۳۰۴ھ

(۱۸۴۸ء تا ۱۸۸۶ء)

عبدالرشید عراقی

مولانا عبدالحی بن مولانا عبدالحلیم بن امین اللہ کا شمار برصغیر (پاک و ہند) کے علمائے کبیر میں ہوتا تھا۔ جن علمائے کرام نے برصغیر میں اشاعتِ دین اسلام' کتاب وسنت کی ترقی و ترویج اور شرک و بدعت و محدثات کی تردید میں درس و تدریس' وعظ وتبلیغ اور تصنیف و تالیف کے ذریعے گراں قدر خدمات انجام دیں ان میں مولانا عبدالحی لکھنوی بھی شامل ہیں۔

مولانا عبدالحی ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء میں باندہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز حفظ قرآن مجید سے ہوا۔ حفظ قرآن میں آپ کے استاد مولوی خادم حسین تھے۔ حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ آپ نے مولوی خادم حسین صاحب سے فارسی اور ریاضی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔ اس کے بعد تمام کتب درسیہ اپنے والد محترم مولانا عبدالحلیم سے پڑھیں۔ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں مولانا عبدالحلیم نے وفات پائی تو مولانا عبدالحی نے بقیہ کتب درسیہ اور علومِ ریاضیہ کی تکمیل اپنے والد کے ماموں مولانا نعمت اللہ لکھنوی (م ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء) سے کی۔

۱۷ سال کی عمر میں مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے تمام علوم اسلامیہ سے فراغت پائی۔ مولانا عبدالحی کے والد مولانا عبدالحلیم نے جب انتقال کیا تو وہ اُس وقت حیدرآباد دکن کے ایک سرکاری مدرسہ میں مدرس تھے اور مولانا عبدالحی اُس وقت اُن کے پاس حیدرآباد دکن میں موجود تھے۔ مدرسہ کی انتظامیہ نے مولانا عبدالحی کو پیشکش کی کہ وہ اپنے والد کی جگہ لے لیں' لیکن آپ نے اس کو منظور نہ کیا اور آپ حیدرآباد دکن کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ تشریف لے آئے۔ مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں:

"۱۲۸۵ھ میں مولانا عبدالحلیم نے انتقال کیا اور ان کے انتقال تک مولوی عبدالحی صاحب حیدر آباد میں ہی مقیم رہے۔ اُن کے انتقال کے بعد اراکین سلطنت نے ان کو ان کے والد کا قائم مقام کرنا چاہا، لیکن اُنہوں نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وطن واپس آ کر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے"۔[۱]

مولانا عبدالحی نے دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ پہلی مرتبہ اپنے والد محترم مولانا عبدالحلیم کے ہمراہ ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء میں۔ دوسری مرتبہ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء میں۔ حرمین شریفین کے قیام کے دوران آپؒ نے وہاں کے جلیل القدر علمائے کرام علامہ سید احمد بن زین حلالی شافعی، مفتی محمد بن عبداللہ حنبلی، شیخ محمد بن محمد غربی شافعی اور شیخ عبدالغنی بن ابی سعید حنفی دہلوی رحمۃ اللہ علیہم سے حدیث میں سند و اجازت حاصل کی۔[۲]

لکھنؤ میں آپؒ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور ساری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ آپ کے تلامذہ کی تعداد کا شمار کرنا ممکن نہیں۔ شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہؒ سابق مدرس اعلیٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (م ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) مولانا عبدالحی کے خاص تلامذہ میں سے تھے اور آپ کے آخری شاگرد تھے۔ (مولانا حفیظ اللہ نے اپنے استاد کے حالات اور اُن کے علمی کارناموں پر ایک کتاب بنام "کنز البرکات لمولانا ابی الحسنات"، لکھی۔)

علم و فضل کے اعتبار سے مولانا عبدالحی جامع الکمالات تھے۔ تمام علوم پر ان کو عبور کامل تھا۔ علمائے کرام نے ان کے علمی تبحر کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا حکیم سید عبدالحی الحسنیؒ (م ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) فرماتے ہیں:

"مولانا عبدالحی علم فتاویٰ میں پورے ہندوستان میں یکتا۔ آپ کا ذکر مشہور اتنا زیادہ کہ سارے علاقہ کے علماء آپ کی بزرگی کی طرف اشارہ کرتے۔ آپ کو اصول و فروع میں قوتِ کاملہ حاصل تھی اور آپ کی قدرت شامل تھی۔ آپ کی فضیلت تمام علوم میں تام تھی"۔[۳]

مولانا عبدالسلام ندوی (م ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۶ء) لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالحی صاحب سے زیادہ جامع معقول و منقول کوئی شخص فرنگی محل میں پیدا نہیں ہوا"۔[۴]

علم المناظرہ میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ علمی و تحقیقی مسائل پر آپ کے تحریری

مناظرے اور بحثیں مولانا عبدالحق بن مولانا فضل حق خیر آبادیؒ (م ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۱ء) اور محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجیؒ (م ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء) سے ہوتی رہتی تھیں۔

مسلک کے اعتبار سے مولانا عبدالحی امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۵۰ھ/ ۷۶۷ء) کے پیروکار تھے۔

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اُن کے مسلک کے بارے میں فرماتے ہیں:

وکان علی مذهب ابی حنیفة فی الفروع والاصول ولکنه کان غیر متعصب فی المذهب. یتبع الدلیل ویترک التقلید' اذا وجد فی مسألة نصًا صریحًا فخالفه للمذهب

''عملاً آپ اصول وفروع ہر مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر عامل تھے۔ اس کے باوجود اپنے مذہب میں متعصب نہ تھے۔ ہر حال میں دلیل کی تلاش کرتے اور تقلید کو چھوڑ دیتے' جبکہ اپنے مذہب کے خلاف کوئی دلیل صریح پاتے۔''(۵)

مولانا عبدالحی کا شمار اصحابِ تصانیف کثیرہ میں ہوتا ہے۔ آپ نے تقریباً ہر فن پر کتابیں لکھیں۔ آپ کی تصانیف عربی و فارسی اور اردو میں ہیں۔ آپ کی تصانیف کی فہرست مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نے نزھة الخواطر میں درج کی ہے' جن کی تعداد ۸۴ بتائی ہے۔(۶)

وفات

مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ/ ۲۸ نومبر ۱۸۸۶ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ عمر ۳۹ برس کی تھی۔(۷)

مولانا سید نواب صدیق حسن خاںؒ کے تأثرات

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی نزھة الخواطر میں مولانا سید نواب صدیق حسن خان کے حالات میں نواب صاحب کے چھوٹے صاحب زادے مولانا نواب سید علی حسن خاں (م ۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۶ء) سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جب والا جاہی (نواب سید صدیق حسن خاں صاحب) کو علامہ عبدالحی بن عبدالحکیم لکھنوی کی وفات کی خبر معلوم ہوئی (اُس وقت آپ حضرات کے درمیان مناظرات اور مباحثاتِ علمی جاری تھیں اور اِن میں سے ہر ایک دوسرے کے خلاف کتابیں اور رسالے لکھ رہا تھا) اُس وقت آپ نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور تھوڑی دیر کے لیے

2

اپنا سر جھکا دیا۔ پھر اپنا سر اٹھایا اور آپ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور آپ شیخ عبدالحی کے لیے دعائے خیر فرماتے تھے۔ پھر آپ نے فرمایا آج علم کا آفتاب ڈوب گیا ہے اور فرمایا کہ ہمارے درمیان جو کچھ اختلافات تھے وہ صرف بعض مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں تھے۔ پھر آپ نے غائبانہ نماز جنازہ کے لیے اعلان فرمایا''۔[۸]

حواشی

(۱) حکمائے اسلام، ج۲، ص ۳۲۸۔

(۲) نزهة الخواطر، ج۸، ص۲۳٤۔

(۳) نزهة الخواطر، ج۸، ص۲۳٥۔

(٤) حکمائے اسلام، ج۲، ص۳۲۹۔

(٥) نزهة الخواطر، ج۸، ص۲۳٥۔

(٦) نزهة الخواطر، ج۸، ص۲۳۷، ۲۳۸۔

(۷) حکمائے اسلام، ج۲، ص۳۲۹۔

(۸) نزهة الخواطر، ج۸، ص ۱۹۳۔

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (56)

صومالیہ

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

صومالیہ : ایک نظر میں

رقبہ: 637,657 مربع کلومیٹر

آبادی: 84 لاکھ

سالانہ شرح پیدائش: 3.40 فیصد

گنجانی: 34 فی مربع میل

دارالحکومت: موغادیشو یا مقدیشو (تیرہ لاکھ)

زبانیں: صومالی، عربی، انگریزی، اطالوی

نسلیں: صومالی 85 فیصد، بانتو اور دیگر 15 فیصد

مذہب: مسلمان 100 فیصد

شرح خواندگی: 37.8 فیصد

کل قومی پیداوار: 4.38 ارب ڈالر سالانہ

فی کس آمدنی: 500 ڈالر

قابلِ کاشت رقبہ: 1.67 فیصد

زراعت: مویشی، پھل، اجناس، سبزیاں

صنعت: ملکی مشینری، پارچہ بافی، چینی

گیس کے ذخائر: 2.832 ارب کیوبک میٹر

برآمدات: 79 ملین ڈالر (مویشی، کیلا، کھالیں، مچھلی، چارکول)

درآمدات: 344 ملین ڈالر (مشینیں، تیل، غذا، تعمیراتی سامان)

تجارتی ساتھی: متحدہ عرب امارات، جبوتی، یمن، کینیا، اومان، برازیل، چین، تھائی لینڈ

کرنسی: صومالی شلنگ

ٹیلی فون: ایک لاکھ

ریلوے: صفر

سڑکیں: 22,100 کلومیٹر

بندرگاہیں: بوماسو، بربرا، قسمایو، مریسیا

شہری فضائیہ: صومالی ائر لائنز میں 51 فیصد حصص صومالیہ کے اور 49 فیصد حصص اٹلی کی ایک فضائی کمپنی الیطالیہ کے ہیں۔

مسلح افواج: 60 ہزار۔ نیوی 700

صومالیہ مشرقی افریقہ کی نوک پر اُس جگہ واقع ہے جو قرن افریقہ کے نام سے معروف ہے۔ اس کے شمال میں خلیج عدن، مشرق میں بحر ہند، مغرب میں کینیا اور حبشہ اور شمال مغرب میں جبوتی واقع ہے۔ خلیج عدن کے ساحل کے متوازی ایک پہاڑی سلسلہ چلا گیا ہے جو تدریجاً بلند ہو کر حبشہ کی سطح مرتفع سے مل جاتا ہے۔ طبعی لحاظ سے علاقہ تین خطوں میں منقسم ہے:

(1) الجوبان (guban) ساحل کے ریتلے پشتوں پر مشتمل ہے۔

(2) اوگو (Ogo) پہاڑی علاقہ ہے اور اس کی آب و ہوا معتدل ہے، لیکن زراعت بمشکل ہوتی ہے۔

(3) توگ (Tog) وہ وادی ہے جو پہاڑیوں اور سطح مرتفع کے درمیان واقع ہے۔ یہ ایک زرخیز خطہ ہے جہاں تمام ندی نالے آ کر گرتے ہیں۔

مختصر تاریخ

قدیم زمانے میں یہ خطہ اس سلطنت کا حصہ تھا جسے مصری سلطنت پنت (Punt) کہتے تھے۔ صومالیہ میں رہنے والے موجودہ قبائل کے آباء واَجداد کا تعلق بنو قریش سے ہے' جو ساتویں صدی میں نقل مکانی کر کے اس سرزمین پر آ گئے تھے۔ ان میں رسول کریم ﷺ کے چچازاد بھائی حضرت عقیلؓ ابن ابی طالب بھی شامل تھے۔ بعدازاں دسویں صدی تک عرب اور ایرانی تاجر یہاں آتے رہے۔ انہوں نے بڑے بڑے شہروں میں تجارتی منڈیاں قائم کیں۔ مقدیشو اور زیلا کے شہر انہی تاجروں نے بسائے تھے۔ اس پورے علاقے میں اسلام انہی تاجروں کے ذریعے پھیلا۔ زیلا کی اسلامی سلطنت تیرہویں صدی میں اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ اس کی سرحدیں خلیج عدن سے لے کر ایتھوپیا کے موجودہ شہر ہرارے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں ہرارے کو اس سلطنت کا دارالحکومت بنایا گیا۔ اس سلطنت کا ایک اہم حکمران امام احمد بن ابراہیم الغازی (1506-1543ء) تھا۔ اس نے ایتھوپیا کے بیشتر علاقے پر قبضہ کر لیا اور شمال میں قسالہ تک جا پہنچا۔ ایتھوپیا کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور اس کے بادشاہ کو پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ پرتگال کو مدد کے لیے پکارا گیا۔ پرتگال کی فوجیں 1541ء میں آئیں۔ انہوں نے ایتھوپیا کی بچی کھچی فوج کی مدد سے امام احمد کو شکست دی۔ 1543ء میں امام احمد کی وفات کے بعد اس کی سلطنت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔

مقدیشو کی اسلامی سلطنت چودھویں سے سولہویں صدی تک اپنے شباب پر تھی۔ پھر یہ سلطان مسقط کے زیر تسلط آ گئی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب سلطنت مسقط کو عمان اور زنجبار کی دو سلطنتوں میں تقسیم کیا گیا تو مقدیشو سلطان زنجبار کے حصے میں آیا۔

زوال پذیر سلطنت زیلا پر خلافتِ عثمانیہ کا تسلط تھا۔ صومالیہ کے اندرونی علاقوں پر خودمختار سردار حکمرانی کرتے تھے۔

1839ء۔ جب عدن برطانیہ کے زیر انتداب آیا تو اس پورے علاقے میں برطانیہ کا عمل دخل بڑھنے لگا۔

1869ء۔ نہر سویز کھلنے پر صومالیہ' برطانیہ اور مصر دونوں کے زیر اثر آ گیا۔

1885ء ۔ برطانیہ نے صومالیہ کے ایک حصے پر حملہ کر کے اور مقامی سرداروں کے ساتھ مل کر اسے مصر سے آزاد کرایا۔

1889ء۔ برطانیہ اور اٹلی کے درمیان طویل جھڑپوں کے بعد بالآخر دونوں نے ملی بھگت سے صومالیہ کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس سے ملک میں بڑی بے چینی پھیلی۔

1899ء۔ شمالی علاقے کے مسلمان محمد بن عبداللہ الحسن کی رہنمائی میں متحد ہو گئے اور انہوں

نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ (یہ جہاد ان کے انتقال 1920ء تک جاری رہا)

1936ء۔ اٹلی اور ایتھوپیا کی جنگ ہوئی، جس کے نتیجے میں ایتھوپیا اٹلی کے قبضے میں آ گیا۔ اٹلی نے صومالیہ کے اپنے والے حصے کو اریٹیریا اور ایتھوپیا میں ضم کر کے ایک نئی مملکت بنا دی، جس کا نام رکھا گیا: ''اطالوی مشرقی افریقہ''۔

1940 اور 1941ء۔ اٹلی کی فوجیں صومالیہ کے برطانوی حصے پر قابض ہو جاتی ہیں۔ پھر چند ماہ بعد زبردست جنگ کے نتیجے میں برطانیہ اپنا حصہ بھی چھڑا لیتا ہے اور اٹلی والے حصے پر بھی قبضہ کر لیتا ہے۔

1948ء۔ برطانیہ نے اوگاڈین کا پورا علاقہ ایتھوپیا کو دے دیا جو اُس وقت سے اب تک وجۂ نزاع بنا ہوا ہے۔

1949ء۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد منظور کی کہ جنوبی صومالیہ کا علاقہ اٹلی کو واپس کر دیا جائے، تاکہ دس سال کے عرصے میں اٹلی اسے ایک آزاد ریاست بنانے کے لیے تیار کر سکے۔

1950ء۔ برطانیہ نے صومالیہ کو ٹرسٹ کے طور پر اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا۔ اسی سال اطالوی ''ٹرسٹی'' بن کر اس علاقے میں دوبارہ وارد ہوئے اور صومالیہ کو آزادی کے لیے ''تیار'' کرتے رہے۔

1960ء۔ یکم جولائی کو جب اٹلی کی دس سالہ سرپرستی کی مدت ختم ہوگئی، اٹلی اور برطانیہ کی مشترکہ کوششوں سے صومالیہ کی آزاد مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ پارلیمنٹ نے عبداللہ عثمان کو صدر اور عبدی رشید کو وزیراعظم منتخب کیا۔

1961ء۔ صومالیہ کا نیا آئین نافذ کیا گیا۔

1967ء۔ عابد رشید علی صدر منتخب ہوتے ہیں۔

1969ء۔ یکم اکتوبر کو عابد رشید علی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس واقعے کے پانچ روز بعد فوج کے کمانڈر نے پولیس کے تعاون سے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور برسراقتدار آتے ہی اُس نے پارلیمنٹ توڑ دی اور آئین منسوخ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کابینہ کے تمام وزراء کو گرفتار کر لیا گیا اور ملک کو ''جمہوریہ'' قرار دے دیا گیا۔ جنرل محمد سعید بارے (فوج کے کمانڈر) کو 25 ارکان کی انقلابی کونسل کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔

1970ء۔ چیئرمین سعید بارے نے مئی 1970ء میں اصلاحی اقدامات کے طور پر بہت سی غیرملکی کمپنیوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

1972ء۔ جنوری میں صومالیہ کو سوشلزم کے خطوط پر چلانے کی مہم چلائی گئی اور اس ضمن میں ایک قانون بھی منظور کیا گیا' جس کے تحت سرکاری ملازمین ایک رہائشی مکان کے سوا دوسرا مکان نہیں رکھ سکتے تھے۔ ایک دوسرے قانون کے ذریعے ڈاکٹروں کو نجی پریکٹس کی ممانعت کر دی گئی۔

1978ء۔ روس اور کیوبا کی فوجی امداد سے ایتھوپیا صومالیہ پر حملہ کر دیتا ہے۔ آٹھ ماہ تک جنگ جاری رہتی ہے' جو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتی۔ حکومت کے خلاف فوجی بغاوت ہوتی ہے' وہ بھی ناکام رہتی ہے۔

1979ء۔ نیا آئین نافذ کیا جاتا ہے۔

1980ء۔ دس سال بعد اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوتا ہے' جس میں جنرل سعید بارے کو آئندہ چھ سال کے لیے پھر صدر منتخب کر لیا جاتا ہے۔ امریکا اور صومالیہ کے مابین ایک معاہدہ ہوا' جس کے تحت طے پایا کہ امریکہ صومالیہ کو اسلحہ دے گا اور صومالیہ امریکہ کو اپنے علاقے میں ہوائی اور بحری اڈے بنانے کی اجازت دے گا۔

1981ء۔ صومالیہ اور ایتھوپیا کے درمیان دوستی کا معاہدہ ہوتا ہے' جس کے نتیجے میں صومالیہ اور لیبیا کے سفارتی تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ صومالیہ اور ایتھوپیا کے درمیان پھر جنگ چھڑ جاتی ہے۔ صدر سعید بارے ایمرجنسی نافذ کر دیتے ہیں۔

1989ء۔ 13 جولائی کو صومالیہ کے فوج کے چند سپاہی دارالحکومت مقدیشو کی چند مساجد میں داخل ہو کر اُن اماموں کو پکڑ کر لے گئے جو مبینہ طور پر ایک کیتھولک بشپ کے قتل کے ایک مقدمے میں مطلوب تھے۔ دوسرے دن دارالحکومت میں فساد بھڑک اٹھے۔ حکومت نے سینکڑوں افراد گرفتار کر لیے۔ تلاشی کے دوران لوگوں کو اُن کے گھروں میں ہلاک کر دیا گیا۔ مساجد کے باہر جھڑپوں میں 70 شہری اور 20 فوجی ہلاک ہو گئے۔ 46 افراد کو ساحل سمندر پر گولیوں سے بھون دیا گیا۔ ''افریقہ واچ تنظیم'' کا کہنا ہے کہ ان فسادات میں 450 افراد مارے گئے۔ زخمیوں کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی۔ دو ہزار گرفتاریاں ہوئیں۔ حکومت کی ایک مخالف تنظیم ''قومی صومالی تحریک'' نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ حکومت نے اندھی طاقت استعمال کی۔ ان خونی واقعات کے بعد کابینہ کے دو وزیروں کو اُن کے عہدوں سے ہٹا کر جیل بھیج دیا گیا۔

1992ء۔ صومالیہ کا بدترین قحط۔ امریکی طیاروں نے خوراک فراہم کی۔ عسکری رہنما محمد فرح عدید نے امریکی فوجیوں کی مزاحمت کی اور انہیں ہلاک کر کے لاشوں کو گلیوں میں پھرایا۔ اس پر اقوام متحدہ نے مداخلت کی۔

اُس وقت سے اب تک صومالیہ شدید ترین طوائف الملوکی اور انتشار کی حالت میں ہے۔
جنرل سعید بارے کے بعد متعدد فوجی سرداروں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر رکھی ہیں۔
2000ء میں ملک کے محبّ وطن سیاسی رہنماؤں نے جبوتی میں پارلیمان کا اجلاس منعقد کیا' جس نے قومی حکومت قائم کر دی' لیکن اس حکومت کا اقتدار ملک کے صرف 10 فیصد حصے تک محدود تھا۔
یہ قومی حکومت اگست 2003ء تک رہی۔قوم کو متحد کرنے میں اسے کچھ ہی کامیابی ہوئی۔

2004ء اکتوبر میں نئی قومی حکومت کے سلسلے میں گفت وشنید شروع ہوئی۔ آخر اگست 2006ء میں 275 رکنی پارلیمنٹ پانچ سال کے لیے وجود میں آ گئی۔ستمبر میں پارلیمنٹ نے نیٹ لینڈ کے صدر عبداللہ یوسف علی کو نیا قومی صدر مقرر کیا۔تاہم صومالیہ کے سیاسی و معاشی حالات بدستور ناگفتہ بہ ہیں۔